نگار

قیمت { فی پرچہ ۷۵ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

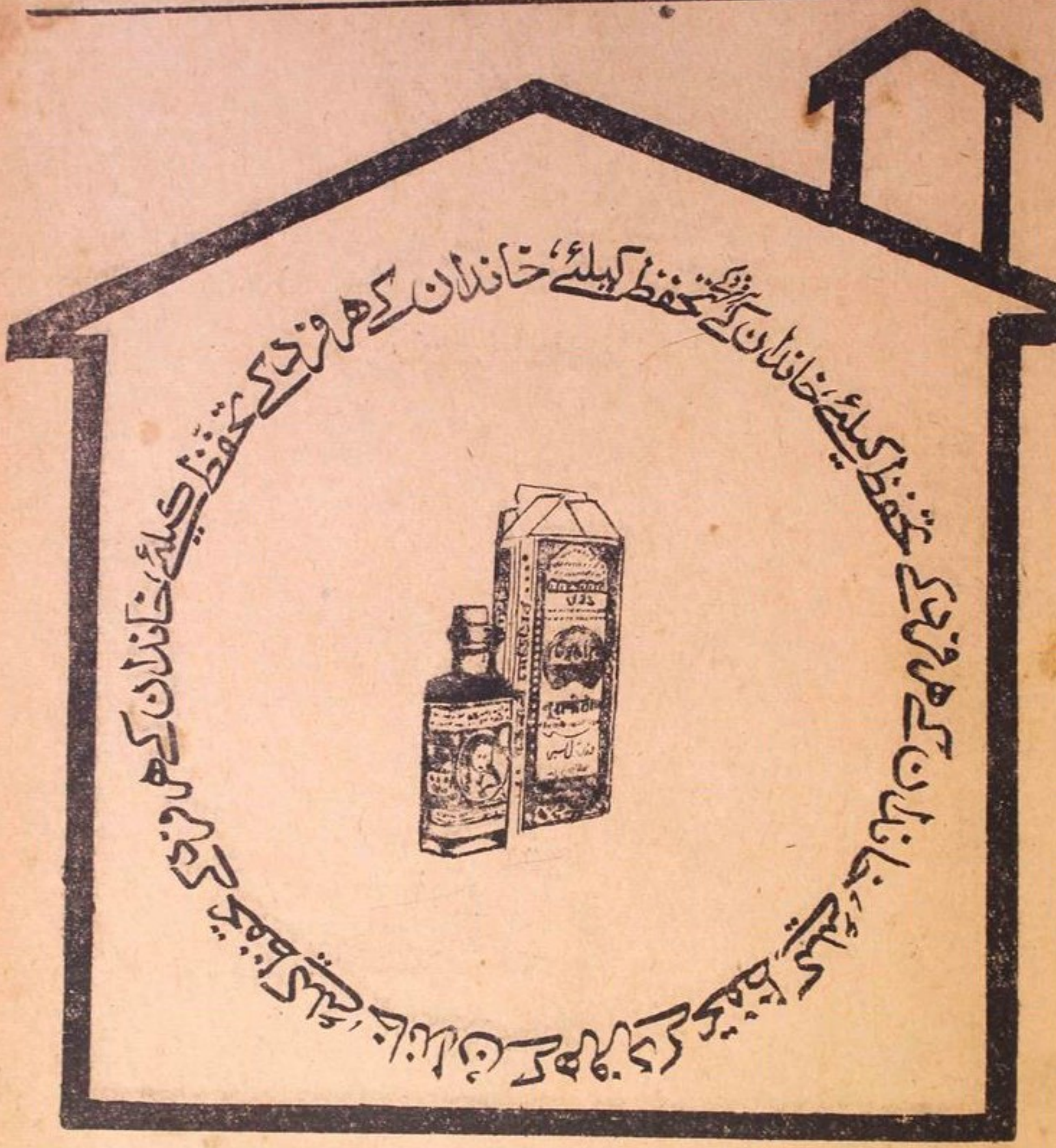

نورانی تیل

- آپ کے خاندان بھر کے تحفظ کے لیے
- حادثوں کے موقع پر نورانی تیل سب سے اہم ساتھی ہے۔
اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے، اور درد چوٹ، زخم ورم سے نجات پانے کے لیے اسے استعمال کیجیے۔

ساختہ: انڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن یوپی

چھوکرہ

بہترین اور نفیس کوالٹی ہے

ہماری خصوصیات

کپڑا	کپڑا	کپڑا
سلکی پلین	سلکی پرنٹس	اونی
جورجٹ	فرنچ ٹوئین	گیبرڈین
بجرگ	چھوکرہ کوٹین	سوٹنگ
کریپ	ساٹن فلورنس	شال
ساٹن	گولڈ کریپ	سرج
ٹفاٹہ	دل بہار	پانامہ
بشرٹ کلاتھ	لنن	پرشیا
شنٹون نائلن	شنٹون	
نیون		

اِن کے علاوہ نفیس سوتی چھینٹ اور اُونی دھاگہ

تیار کردہ

دی امرتسر رین اینڈ سلک ملز پرائیویٹ لمیٹڈ۔ جی ٹی روڈ امرتسر

ٹیلیفون 2562 تار کا پتہ "رین" (RAYON)

ایجنٹ

ٹراونکور رین لمیٹڈ۔ برائے سلکی دھاگہ ورمومی (سیلوفین) کاغذ

نگار

ایڈیٹر:- اکبر علی خاں

ضروری اعلان

پاکستانی خریدار نگار کا چندہ اس پتہ پر بھیجدیں۔ رسالہ جاری کر دیا جائیگا

نمائندہ نگار ۶۱۷/این سمن آباد لاہور

جلد ۴۲ | فہرست مضامین ستمبر ۱۹۶۳ء | شمارہ ۹

ملاحظات		۳
مکاشفات الاسرار	میکش اکبر آبادی	۵
حکایت اور داستان	ڈاکٹر گیان چند	۱۰
دیسی کا خط پردیسی کے جواب میں	عطا محمد شعلہ	۱۴
شوکت ۔ ایک دوست ایک ساتھی	قاضی عیاذ انصاری	۱۹
روح الامین ادیب	سید مرتضیٰ حسین ملگرامی	۲۵
داستان بے ستون و کوہکن	شمیم کرہانی	۳۳
مطبوعات موصولہ	(میرٹھ کالج میگزین)	۳۷

مُلاحظات

نگار کا اشاریہ نمبر

نگار نے چالیس سال تک علم و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ اردو صحافیت کا ایک روشن باب ہیں۔ اردو ادب کا کوئی مورخ نگار کے ذکر سے دامن کشاں نہیں گزر سکتا۔ نگار نے انداز فکر و اظہار کو نئے نئے افق عطا کیے ہیں اور لب و لہجے کو شگفتگی اور خوش سلیقگی کے رنگا رنگ پہلو بخشے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان صفحات پر جو خیالات پیش کیے گئے ان میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کا اعتراف بھی ضرور کرنا چاہیے کہ ذہنی بالیدگی کے لیے کسی قدر جرأت رندانہ بھی درکار ہوتی ہے۔ اور اُردو داں طبقے کو اس جرأت رندانہ سے متعارف کرانے میں نگار کو بڑا دخل رہا ہے۔ یوں بھی خالص ادبی علمی تحقیقی اعتبار سے جو تحریریں نگار کے ہزاروں صفحات میں موجود ہیں ان سے علم و ادب کے طالب علم کو اکثر و بیشتر رجوع کرنا پڑے گا۔ اس لیے اس بات

کی ضرورت ہے کہ ایک جلد میں نگار کی ساری تحریروں کا تفصیلی اشاریہ مرتب کر دیا جائے۔ مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے مسرت ہے کہ نگار رام پور جلد از جلد نگار کا مکمل اشاریہ ایک خاص نمبر کی صورت میں شایع کرے گا۔ یہ کام محترمہ سعدیہ حفیظ اور محترمہ خالدہ عباسی نے ڈاکٹر محمود الٰہی کی نگرانی میں بڑی محنت اور ذوق و شوق کے ساتھ انجام دیا ہے۔ نگار کا یہ اشاریہ نگار دوستوں کے لیے خصوصاً اور عام ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے عموماً باعث کشش ہوگا تحقیقی کام کرنے والوں کو قدم قدم پر اس انداز کے اشاریوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر مخزن، زمانہ، معارف، برہان، جیسے اہم رسائل کے اشاریے مرتب کر دیئے جائیں۔

احوال و آثار آزردہ

شاید ہی کوئی خوش ذوق ایسا ہو جس نے مندرجہ ذیل اشعار نہ سنے ہوں۔

میں اور ذوق بادہ کشی، لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

کامل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

مکھڑا وہ بلا زلف سیہ فام وہ کافر
کیا خاک جیے جس کی شب ایسی سحر ایسی
یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
یا لا کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

لیکن شاید بہت کم حضرات کو علم ہوگا کہ یہ اشعار مفتی صدرالدین آزردہ کے ہیں جو اپنے زمانہ کے ایک جید عالم ادب دوست اور خوش گو شاعر تھے آزردہ کی فنکارانہ عظمت کا اعتراف ابھی تک باقاعدہ طور پر نہیں کیا گیا نہ ان کے احوال و آثار پر کوئی مستقل تالیف شایع ہوئی تھی۔ نگار کے صفحات پر پہلی بار آزردہ سے متعلق اس قسم کی ایک ہمہ جہت کتاب کو قارئین کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ یہ کتاب اردو کے جواں سال باصلاحیت نقاد و محقق ڈاکٹر خلیق انجم نے تیار کی ہے۔ اس میں آزردہ کی زندگی تصانیف اور کلام کا جائزہ لیا گیا ہے اور جتنا کچھ اردو فارسی عربی کلام تذکروں وغیرہ میں مدفون تھا۔ اس سب کو ایک لڑی میں پرو لیا گیا ہے۔ یہ تالیف نگار کے ایک ہی شمارے میں شایع کر دی جائے گی۔

مکاشفات الاسرار

میکش اکبرآبادی

حضرت جی سید علی غمگین[1] دہلوی رحمۃ اللہ علیہ متاخرین صوفیہ میں شاعرانہ اور صوفیانہ دونوں اعتبار سے ایک بلند درجہ رکھتے ہیں۔ اس دوران میں حضرت کے حالات اکثر ادبی رسائل میں شائع ہوے ہیں اور مزید تعارف کی احتیاج نہیں ہے۔

مکاشفات الاسرار حضرت کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ جو تقریباً ۱۸۰۰ رباعیات پر مشتمل ہے۔ ان رباعیات کی شرح خود حضرت نے فرمائی جس کا نام مراۃ الحقیقت ہے۔

حضرت جی غمگینؒ سے پہلے بھی اردو کے ایسے شعراء گذرے ہیں جن کا کلام ادبی اعتبار سے اور حقائق و معارف کے بیان کے اعتبار سے بہت بلند ہے مگر حضرت غمگین غالباً پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو رباعیات کے ذریعہ تصوف کے تمام ضروری مسائل بیان کر دیئے ہیں۔

کوئی علم اور کوئی زبان بہ ذات خود نہ اچھی ہے نہ بری طریق استعمال اور نیت و مقصد ہر شے کو اچھا اور برا کر دیتے ہیں۔ یہی حال فلسفے اور تصوف کا ہے۔ مسلمان جب فلسفۂ یونان سے آشنا ہوئے تو ایک طبقے نے ہر نئی چیز کی طرح اس کی بھی مخالفت کی اور دوسرے طبقے نے اس کا مطالعہ اور اس سے واقفیت حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ یہ تفرقت اور توجہ تقریباً اہل علم کے ہر طبقے میں رہی چنانچہ بعض صوفیا نے بھی اِن جدید علوم کا مطالعہ کیا اور ان کی اصطلاحات اور نظریوں کو اپنے اصول اور مسلک کی تائید میں استعمال کیا جب کہ بعض صوفیہ نے ان علوم سے احتراز کیا اس طرح کی دونوں مثالیں حسن اتفاق سے ہمیں ایک ہی زمانے کے دو بڑے مشائخ میں ملتی ہیں۔ حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی کی مشہور کتاب عوارف المعارف کا پورا انداز ایک مستند حدیث کی کتاب کا سا ہے۔ لیکن آپ ہی کے ہم عصر حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی مشہور تصنیف فصوص الحکم اس زمانے کے فلسفیانہ رجحان کی پوری نمائندگی کرتی ہے حالانکہ دونوں کتابیں تصوف پر لکھی گئی ہیں اور دونوں کتابیں عام صوفیوں میں مقبول اور مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ دونوں بزرگ ایک ایک واسطے سے حضرت غوث اعظم میراں محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے فیض یاب ہیں۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اپنے چچا شیخ ابو النجیب عبدالقاہر سہروردی کے خلیفہ اور تعلیم یافتہ ہیں اور شیخ ابن عربی کی تعلیم و تربیت حضرت ابو مدین مغربی نے فرمائی ہے۔ اور شیخ ابو النجیب اور شیخ ابو مدین مغربی دونوں حضرت غوث الاعظم کے اجل خلفا میں سے ہیں۔

تصانیف اور انداز بیان کا یہ اختلاف ہر عہد میں برقرار رہا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں اکثر صوفی مصنف حضرت ابن عربی سے متاثر رہے ہیں اور مولانا جامیؒ کی معرفت ابن عربی کے تصوف کا اثر ہندوستان کے تمام ہی صوفی مصنفین پر پڑا ہے۔ البتہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادیؒ سے پہلے کے صوفیائے چشت کی تصانیف میں یہ اثر نہیں ملتا۔

مکاشفات الاسرار کی رباعیات میں جو تصوف بیان[2] کیا گیا ہے۔ وہ وہی ہے جو متاخرین صوفیہ میں عام تھا اور جس میں ابن عربیؒ کے فلسفے کی آمیزش تھی چنانچہ ان رباعیوں میں جہاں ایک طرف قدیم تصوف کے اصول توبہ، پاکیزگیٔ نفس، عشق، فقر، ذکر و فکر، وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔ تو دوسری طرف احاطۂ ذہنی

---

[1] ولادت ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء ۔ دہلی ——— وفات ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء ۔ گوالیار۔

[2] یہ تمام تصانیف غیر مطبوعہ ہیں اور حضرت جی سردار محمد صاحب (حضرت جی رضا محمد صاحب) کے کتب خانہ واقع گوالیار میں موجود ہیں۔ جو حضرت جی کے سجادہ اور صحیح وارث ہیں۔

اعیان ثابتہ، اعیان خارجہ۔ بحث بحولیت۔ وجود ذہنی۔ وجود علمی وغیرہ پر بہت سی رباعیات ملتی ہیں۔ اور شاید تصوف کا کوئی اہم مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر کوئی رباعی نہ ہو۔ اس موقعہ پر وحدۃ الوجود کا شمار فلسفیانہ تصوف کے ضمن میں میں نے قصداً نہیں کیا کیوں کہ یہ اصطلاح اگرچہ فلسفیانہ ہے اور یہی وہ مسئلہ ہے جو خصوصیت سے صوفیہ اور مخالفین صوفیہ میں مختلف فیہ ہے۔ لیکن یہ لفظی اعتبار سے ہی فلسفیانہ اصطلاح ہے ورنہ فلسفی صوفی اور غیر فلسفی صوفی سب ہی اس مسئلہ پر متفق ہیں۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے۔

تو اے ناداں دل آگاہ دریاب — بخود مثل نیاگاں راہ دریاب
چہ باں مومن کند پوشیدہ رافاش — ز لا موجود الا اللہ در یاب

علامہ اقبالؒ کی یہ رباعی قدیم اور سادہ تصوف کی مثال میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت غمگینؒ کی رباعی سنیئے اور اندازہ کیجیے کہ اردو و فارسی کے فرق کے باوجود حضرت غمگین کی رباعی کتنی فلسفہ آمیز ہے۔

ممکن کو قیام صرف ہے غیر کے ساتھ — از خود ہو اگر تو پھر عدم سے ہو نجات
موجود نہیں ہے جز وجود واجب — اس کا ہے وجود جو ہے قائم بالذات

مکاشفات الاسرار کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ دیوان شاہ غمگین نے مرزا غالب کے لیئے لکھا تھا چنانچہ دیباچے میں اپنے حالات اور نسب وغیرہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"پہلے میں نے ایک دیوان ریختہ میں لکھا تھا اُسے دور کر دیا۔ اب کہ میری عمر ساٹھ سال ہونے آئی جو واردات اور ذوق شوق عشق حقیقی اور مجازی کے تھے وہ میں نے ترتیب دیئے اور بعض خاص غزلیں پہلے دیوان کی دوسرے دیوان میں شامل کر لیں۔ جب نیا دیوان مکمل ہو گیا تو چونکہ ابھی واردات اور کیفیات کا میرے دل پر غلبہ باقی تھا۔ میں نے چاہا کہ برادر دینی عزیز از جان اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ غالب واسد کے واسطے جو اس زمانے میں نظم و نثر میں اپنا نظیر نہیں رکھتے ہیں۔ رباعیات کے پیرائے میں تصوف کا رسالہ ترتیب دوں۔ اس لیئے تمام مضامین اعلیٰ سے ادنیٰ تک جو لوگوں کو معلوم ہیں یا نہیں رباعیات میں درج کر دوں جس سے مبتدی اور منتہی دونوں فائدہ اٹھالیں۔" (ترجمہ)

اسی سلسلے میں حضرت نے تحریر فرمایا کہ ——————

"اگر یہ دیوانِ رباعیات کسی بزرگ کے ہاتھ لگے تو مجھے امید ہے کہ وہ اس کو مقلدوں، ملحدوں اور خلاف شرع لوگوں سے پوشیدہ رکھیں گے۔ ہر چند کہ مقلد اور ملحد غیر حق نہیں ہیں بلکہ عین حق ہیں۔ لیکن بزرگان متقدمین و متاخرین کا طریقہ اسی طرح چلا آتا ہے کہ اسرار باطنی کو ظاہر بینوں سے پوشیدہ کرتے آئے ہیں۔ اس لیئے ہمیں بھی اُن کا اتباع واجب ہے۔" (ترجمہ)

یہی بات حضرت جیؒ نے مرزا غالب کو ایک خط میں لکھی مرزا غالب نے اس کے جواب میں جو خط حضرت جی کو لکھا ہے اس کی نقل یہاں غیر مناسب نہ ہوگی۔ اس خط کا ترجمہ دانستہ نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ مرزا صاحب کا اصل خط ہی پیش کیا جا رہا ہے۔

قبلۂ حاجات۔ انچہ نخست دل را بہ نشاط تو نگر کرد دیدن روئے سید امانت علی بود سلمہ اللہ تعالیٰ کہ دیدہ را فروغ دیگر بخشید۔ چوں از بازیافتگانِ قدسی انجمن اندگرد سر شام گردیدم دکفت پائے شاں بوسیدم مشاہدۂ منشور آگہی کہ عبارت از والا نامہ است نورے دیگر افزود غزل ہم بہ ذریعہ سید صاحب و فقیر صاحب فرستادہ آمد مقارن آں آدم دیگر رسید و پروانۂ دیگر رسانید شادماں شدم و عنوانِ دیوانِ رباعیات شادماں ترساخت سرمایہ آنم کو کہ آں ہمہ گہر بہ رشتۂ نگارش از بہر من کشیدہ آید وآں گاہ ایں مایہ مکرمت کہ خود از بندۂ خود می پرسند کہ اگر دستوری دہی دیباچہ را بنام تو نگار بندم۔ ایں پرسش خود ادائے نوازش دیگر است کہ زباں اندازۂ سپاس آں بر تتابد۔ قبلہ گاہا فضولی می کنم و چوں فرمان چنیں است می گویم کہ گنجیدن نام من در آں نامہ نہ تنہا از بہر من بلکہ از بہر آبائے من سرمایۂ نازش جاودانی است لیکن ہمہ آں خواہم کہ مرید خود را بیش از اندازہ دراں نگارش نہ ستانید دکم ترین بندۂ خود دانمایند کہ ہر آئینہ اندریں صورت ہم مدعائے خدام حاصل می شود و ہم خواہش ایں

ننگ آفرینش روا نیست بالجملہ چشم بہ راہم کہ دیوان رباعیات کے می رسد من بداں کے رسم فرمان چنانست کہ آں نوشتہ را از نظر اغیار نہاں دارم ہم چنیں خواہم کرد اما کو فیر پس از گزارش ایں بذکر کہ البتہ خلاف رائے دانش آرائے نہ خواہد بود سخنے دیگری گویم تا حضرت را ذوق و مرا اعتبار افزاید بیتے از بیت ہائے قیصر داخلِ صحیفۂ منتخب است۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے　　خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

من خود فرماں پذیر فتم لیکن فرمان خرد اندریں باب آں ست کہ ہر نگرندہ بہ دیدن آں الفاظ بہ کنہ معنی نہ تواند رسید و ہر کہ معنی را نیک تواند فہمید جز آئینۂ غیر نیست چہ دریں عالم تفرقہ کعبہ و دیر نیست سخن ہائے دل آویز کہ گستاخانہ گزاردہ شد خاطر نشین دل نشین باد زیادہ عدادب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عریضہ نگار اسد اللہ

"روز نگارش نامہ دہم ذالحجہ ہنگام شام کہ مشفقی سید حیدر علی صاحب و اکبر چیاں کہ با من گفتند اگر رسیدہ باشند بہ سید پیر علی صاحب نیز سلام ہائے مشتاقانہ خوانند و مشتاق دانند"۔

اور اس خط کے بعد جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں اہم مسائل تصوف موضوع بحث بنے رہے یہاں تک کہ حضرت جی نے مرزا غالب کو لکھ دیا کہ آئندہ خطوں میں تصوف کا مذکور نہ ہو۔ حضرت جی نے مرزا صاحب کو جو اخفا کے لیے تاکید کی تھی وہ بے جا نہ تھی مثال میں حضرت جی کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے۔

ایک عمر رہی ہے میری اللہ کی جنگ　　دیتا میں رہا شکست تو تو فرنگ
غمگین مغلوب اب ہوا ہوں ایسا　　نہ فوج رہی نہ میں نہ وہ نام و ننگ

یہ رباعی کتنی وجہ اعتراض بن سکتی ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے ایسی ہی بہت ہیں جن کی وجہ سے تصوف ہدف ملامت بنتا رہا ہے لیکن اس کی شرح خود حضرت جی کی زبان مبارک سے سنیئے۔ اس کے بعد اس رباعی کا مفہوم قابل اعتراض نہ ٹھیرے گا۔ اور حضرت جی کی اخفا کی تاکید کی اہمیت بھی روشن ہو جائے گی۔ خود پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔ تکلموا الناس علی قدر عقولھم (اوکما قال) لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرو ——— شرح ملاحظہ ہو۔

"جس وقت کہ تم حق سبحانہٗ تعالیٰ سے صلح کر لو گے اور توبہ کر لو گے اور اپنے گناہوں پر پشیمان اور شریعت و طریقت نبوی کی اطاعت کر لو گے۔ خدا کی محبت تم میں پیدا ہو جائے گی اور ذکر و مراقبہ کرنے لگو گے۔ تو اس وقت تم میں اور خدا میں جنگ عظیم واقع ہو جائے گی اور ہنگامہ دار و گیر گرم ہو جائے گا۔ کیونکہ تم اس وقت اپنی خودی کے علم کے سلطان ہو گے اور تمہارے ساتھ تعینات اور خطرات اور دوسری صفات ظاہری و باطنی کا ایک عظیم لشکر ہو گا۔ اور یہ جنگ ایک مدت جاری رہے گی۔ اور اکثر غلبہ اور فتح تم ہی کو حاصل ہو گی۔ حالانکہ وہ غلبہ اور فتح تمہاری شکست ہے۔ پس اس وقت لازم ہے کہ اپنے آپ کو کسی صاحب نسبت جذبی کی خدمت میں حاضر کرو تاکہ تمہیں جلد شکست ہو جائے۔ اور یہی شکست تمہارے لیے فتح باب بن جائے گی۔ اور تھوڑے دن بعد تمہارے لشکر کو شکست فاش ہو جائے گی۔ اور تعینات و خطرات کا لشکر برباد ہو جائے گا تمہاری سلطنت پر زوال آجائے گا۔ اور تمہاری خودی مٹ جائے گی۔ پھر اس شکست کے بعد صلح کا دروازہ تم پر کھل جائے گا۔ تم فنا ہو جاؤ گے اور اپنی اصل تک پہونچ جاؤ گے"۔ ——— (ترجمہ)

اب تصوف کے مختلف مسائل پر مشتمل کچھ رباعیاں پیش کی جاتی ہیں۔ جن سے مکاشفات الاسرار کی ادبی اور علمی حیثیت کا اندازہ ہو سکے گا۔ رباعیات کے عنوان اصل کتاب میں جس طرح ہیں اسی طرح نقل کیئے جاتے ہیں۔

در وحدۃ وجود

جو کہتے ہیں لوگ سب یہ کثرت کثرت　　آتی ہے سخن پہ ان کی مجھکو حیرت

غمگین نہیں قال و حال پر موقوف کثرت کو وجود ہی نہیں ہے تنزہ احدت

در احاطۂ ذاتی گوید

غمگین گر تری اس دوئی سے ہو نجات جو دید میں آئے عین ہے اُس کی ذات
بالذات نہ ہو یہاں اگر وہ موجود کس طرح سے اس کے پھر ہوں اسماء و صفات

در حقیقت تنزیہہ

بے فائدہ کر نہ اس کی تو گفت و شنود جس کا نہ مشابہہ ہو نہ جس کی ہو دید
توحید پر اعتقاد رکھنا نہ کبھی بس اس کے سوا نہیں ہے غمگین توحید

در بیان توحید ایمانی کہ اول امت

توحید کے چار مرتبے ہیں اے یار اول ایمانی جس میں سب ہیں دیندار
وہ یہ ہے کہ حق کی واحدیت کا تو باصدق کرے زبان و دل سے اقرار

در بیان حقیقت ایمان کامل

مشکل ہے لا نا حد خدا پر ایمان میں رکن بتاؤں جس میں سب ہوں ارکان
وہ یہ ہے خودی نہ رہوے اپنی غمگین بن اس کے نہ ہوگی تیری مشکل آسان

در تعریف صوفی گوید

غمگین صوفی غرض لقب اس کا ہے جس کو کہ وجود ہی نہیں ہوتا ہے
صوفی کی نہ پوچھ تو حقیقت مجھ سے صوفی نہیں پوچھتا کہ صوفی کیا ہے

در معنی تصوف

سب صوفی کہیں ہیں اے یہ غمگین اعلا جز اس کے نہیں ہے کچھ تصوف بہ خدا
اُس شغل میں بسر کرے وقت عزیز جو دونوں جہان میں ہو سب سے اعلیٰ

در معنی تصوف و حقیقت فقر

غمگیں کوئی پوچھے گر تصوف کیا ہے کہہ بے خودی اپنی میں شہود اس کا ہے
جو پوچھے فقیر کس کو کہتے ہیں تو کہہ مفلس آپے سے اپنے جو ہوتا ہے

در حقیقت کفر

غمگیں ہے کفر ظاہری تو ظاہر پر کفر حقیقی سے نہیں تو ماہر
وہ یہ ہے کہ محو حق میں ہو تیرا وجود بن اس کے نہ کفر سے تو ہوگا طاہر

در بیان اعیان ثابتہ

اعیانِ ثابتہ کا سُن مجھ سے تو بیاں موجود قدیم علم حق میں ہے نہاں
معدوم وہ ہوئے نہ ہوں گے غمگین یہ صورتیں کوئی سب ہوئیں ان سے عیاں

یعنی ممکنات خارجیہ را ہم عیاں گویند

کہتے ہیں ممکنات کو بھی اعیان عارف سے نہیں ہے یہ راز کچھ پنہان
سونگھی ہی نہیں انھوں نے پر بوئے وجود معدوم ہیں یہ ہمیشہ اے غمگین جان

اعیان ثابتہ را باوحدت ہماں نسبت است کہ برف را با آب وہم چنیں اعمال صالحہ را با جنت

اعیان ثابتہ میں یوں ہے وحدت ہے برف میں جیسے آب بالعینیّت
ایسے ہی سمجھ لے سب مثالیں جیسے اعمال صالحہ ہیں عین جنت

در بیان آں کہ اولیت و آخریت اعتباراند

تو جس کو سمجھ لے ابتدا ہے غمگین اور جان لے جس کو انتہا ہے غمگین
یہ دونوں تعین خیالی ہیں ترے اُس کو تو نہ حد نہ منتہا ہے غمگین

در ترغیب شرع شریف کہ اہم مقامات اولیا است

غمگین اُس سے اگر تجھے ہے کچھ کام عرفان کو اپنے رکھ تو بالائے بام
منظور تجھے اگر خوشی ہے میری جاری اپنے پہ شرع کے کر احکام

در برئیت آدم علیہ السلام

غمگین مرضی ہے ادا اور امر ہے اور اس میرے سخن کو تو سمجھ خوب بہ غور
آدم کو کہا کہ تو نہ کھانا گندم اور مرضی یہ تھی کہ اس کو کھا دے پُرزور

در ترغیب خدمت خلق

خدمت سے خلق کی نہ رہنا محروم اور ہو نہ سکے تو چاہیئے ہو مغموم
ممکن نہیں جو جہاں میں غمگین کوئی بے خدمت خلق یار ہوئے مخدوم

موتوا قبل ان تموتوا

ہر چند بلائے ناگہانی ہے موت اک روز نہ اک روز تو آنی ہے موت
مرنے سے پہلے ہی جو مرے اے غمگین واللہ کہ اس کی زندگانی ہے موت

در اختتام گوید

کب تک کروں درد عشق کا اپنے بیاں کب تک کروں اپنے تر بوشیدہ عیاں
غمگین ہے آہ کم بہت فرصت عمر اور قصۂ حال ہے میرا بے پایاں

آزردہ ——— احوال و آثار

ڈاکٹر خلیق انجم کی گراں قدر تالیف کا انتظار کیجئے

جو

نگار کے ذریعے جلد پیش کی جائے گی۔

منیجر

حکایت اور داستان

ڈاکٹر گیان چند

اردو کے قدیم افسانوں کو حکایت اور داستان دو خانوں میں تقسیم کیا ہے لیکن یہ تقسیم نہ بالکل واضح ہے نہ تشفی بخش۔ ایک عام عقیدہ یہ ہے کہ حکایت مختصر ہوتی ہے اور داستان طویل لیکن یہ کوئی اصولی بنیادی فرق نہ ہوا۔ داستان بھی حکایت کی طرح کوزے میں دریا کی مثال ہو سکتی ہے۔ مثلاً" طوطا کہانی کی چوبیسویں کہانی کا خلاصہ ملاحظہ ہو:

"کابل کے ایک سوداگر کی لڑکی حسن میں شہرۂ آفاق تھی کسی ملک کے تین ہنرمند جوان سوداگر کے پاس درخواست لے کر آئے۔ ان میں سے ایک گمشدہ چیز کا پتہ بتا دیتا تھا۔ دوسرا ایسا کل کا گھوڑا بناتا تھا جو تخت سلیماں سے بھی آگے نکل جائے۔ تیسرا ایسا تیر انداز تھا جس کا تیر خطا نہ کرتا تھا۔ رات کو نازنین کہیں غائب ہو گئی پہلے جوان نے دریافت کیا کہ اسے ایک پری فلاں پہاڑ پر لے گئی ہے۔ دوسرے جوان نے کاٹھ کا گھوڑا بنا کر دیا جس پر تیر انداز جوان سوار ہو کر گیا اور پری کو مار کر شہزادی حسن کو لے آیا۔ اب ہر جوان یہ چاہتا تھا کہ حسینہ کی شادی اسی سے ہو۔ طوطے نے فیصلہ کیا کہ پہلے دو نے محض اپنا ہنر دکھایا لیکن تیسرا اپنے جی پر کھیل کر ایسی جان جوکھوں کی جگہ گیا اسی لیے وہ دولت بیدار اسی کا حق ہے۔"

اس مختصر کہانی میں داستان کے تمام خصائص پائے جاتے ہیں۔ اسے ہم حکایت نہ کہہ داستان کہنے پر مجبور ہیں۔ یہاں یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ فوق فطرت عنصر داستان کی لازمی خصوصیت نہیں۔ یہ داستان کو رنگینی اور استعجاب فراہم کرتا ہے۔ لیکن داستان اپنے وجود کے لیے اس کی تابع نہیں۔ الف لیلیٰ کی "سوتے جاگتے کی کہانی" بہت دل چسپ اور اعلیٰ درجے کی داستان ہے۔ لیکن اس میں کوئی فوق فطرت مخلوق یا واقعہ نہیں۔ طوطا کہانی کی بیسویں داستان ملاحظہ ہو:

"کسی شہر میں ایک شخص بشیر اور ایک منکوحہ عورت چندو میں معاشقہ تھا۔ اس کے شوہر کو اس کا علم ہوا تو وہ بیوی کو اس کے میکے میں لے گیا۔ بشیر ایک اعرابی کے ساتھ اس شہر میں گیا اور اعرابی کی معرفت چندو کے پاس خبر بھیجی۔ چندو نے کہلا دیا کہ رات کو فلاں مقام پر ملاقات ہوگی۔ حسب وعدہ وہ وہاں پر آئی اور اعرابی سے کہا کہ تو میرے کپڑے پہن کر میرے گھر جا اور گھونگھٹ سے منہ چھپا کر انگنائی میں بیٹھ جانا۔ شوہر دودھ کا پیالہ پینے کو دے گا تو کچھ نہ بولنا۔ تھک ہار کر وہ باہر چلا جائے گا۔ اعرابی نے ایسا ہی کیا لیکن اس کے خاموش رہنے پر شوہر نے دل کھول کر کوڑے بازی کی اور پھر باہر چلا گیا۔ چندہ کی بہن اسے سمجھانے آئی اس نے چندہ کی بہن پر سب راز منکشف کر کے کہا کہ تو میرے ساتھ سو اور راز فاش نہ کرنا ورنہ تیری بہن کی رسوائی ہوگی۔ بہن ہنس کر راضی ہو گئی اور اعرابی نے مار کھانے کے بعد زندگی کا خط اٹھایا۔"

اس مختصر داستان میں نہ فوق فطرت ہے نہ اس کا ہیرو کوئی شاہزادہ یا سوداگر بچہ ہے۔ لیکن اسے بھی حکایت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مختصر دمانی داستان ہی کہنا پڑے گا۔ پھر حکایت اور داستان کے درمیان مابہ الامتیاز کیا ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے Life of Aesop کے دیباچے میں Fable کی تعریف یوں کی ہے۔

"یہ ایک بیانیہ ہے جس میں حیوان یا بے جان اشیاء اخلاقی تلقین کے لیے آدمی کی طرح بولتے چلتے ہیں۔ اور انسانوں جیسے کام کاج کرتے ہیں"

اس تعریف میں حکایت کی سب سے بڑی خصوصیت اخلاقی تلقین کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور اس کے کرداروں کے طرف بھی۔ جانوروں کی حکایات بھی دو قسم کی ہوتی ہیں۔ اول وہ جن میں جانور محض حیوان کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں مثلاً ایسپ کی ذیل کی کہانی میں

"ایک کتا منہ میں آدھی روٹی لیے دریا کے کنارے جا رہا تھا اس نے پانی میں اپنا عکس دیکھ کر سوچا کہ پانی والے کتے کی آدھی روٹی بھی مل

جائے تو پوری ایک روٹی ہو جائے گی۔ اس غرض سے وہ اپنے عکس کی طرف منھ بڑھا کر پھونکا اور آدھی روٹی سے بھی ہاتھ دھو لیا"

دوسری نوع میں حیوانات انسانوں کی فہم و فراست سے متصف کر دیے جاتے ہیں۔ مثلاً مذہب عشق (نثری گل بکاولی) میں مرغ زبرک اور صیاد کی حکایت میں طوطا ایک ذی ہوش حکیم کی سی باتیں کرتا ہے۔ کلیلہ دمنہ میں حیوانات کے پردے میں گویا انسانوں کو مدبری کی تعلیم دی ہے۔ حکایتوں میں فوق فطرت عنصر صرف اس قدر ہوتا ہے کہ جانور انسانوں کی طرح بولتے ہیں اور اکثر انسانی ادراک اور انسانی جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

حکایات کا ایک بڑا حصہ حیوانات سے متعلق ہے لیکن ڈاکٹر جانسن کی تعریف کے علی الرغم کم از کم اردو حکایت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ حیوانات ہی کی روئداد ہو۔ مہجور کے نورتن کے چھٹے باب کی ایک حکایت ملاحظہ ہو

ایک دانش مند افلاس کا مارا کسی شہر میں گیا۔ لوگوں نے کہا کہ فلاں شخص حاتم طائی ہے تو اس کے پاس جائے تو مالا مال ہو جائے گا۔ وہ دانشمند حال کشف سے اس امیر کے پاس گیا لیکن وہ امیر اسے مطلق خیال میں نہ لایا۔ اگلے دن وہ عاقل کرائے پر لائی ہوئی فاخرہ ستھری پوشاک سے ملبوس ہو کر گیا۔ امیر نے خوان نعمت حاضر کیا۔ دانشمند لقمہ تیار کر کے جیب و آستین میں رکھنے لگا۔ امیر نے کہا کپڑے کیوں خراب کرتا ہے۔ عاقل نے اپنا احوال بتا کر کہا کہ تو جو آج اس قدر تکلف کیا وہ لباس ہی کا حق ہے۔"

اب تک ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حکایت میں اخلاقی سبق کا ہونا ضروری ہے۔ بعض حکایات میں اخلاقی تلقین اتنی نمایاں نہیں ہوتی جتنا کسی کی فہم و فراست کی تیزی مثلاً نورتن کے تیسرے باب کی یہ مشہور حکایت سنیئے:

"ایک شخص کے گھر میں کچھ اسباب دیوان خانے سے چوری ہو گیا۔ وہ قاضی کے پاس فریاد لے گیا۔ قاضی برابر کی کئی چھڑیاں لایا اور صاحب خانہ اور اس کے ملازمین کو ایک ایک چھڑی دے کر کہا کہ اس چھڑی کا خواص یہ ہے کہ چور کے پاس یہ ایک انگل بڑھ جاتی ہے۔ کل صبح تم لوگ اسے واپس لاؤ۔ چور نے اپنی عقل لڑائی کر اسے ایک انگل تراش ڈالیے تاکہ راز فاش نہ ہو۔ اس نے ایسا ہی کیا اور قاضی نے اسے گرفتار کر لیا"

اس کہانی پر انگریزی لفظ Fable کا اطلاق نہیں ہو سکتا لیکن اردو میں بلا تامل حکایت کہہ سکتے ہیں۔ اس میں فہم و ذکاوت کے مظاہرے کے ساتھ ایک اخلاقی پہلو بھی ہے کہ سانچ کو آنچ نہیں جھوٹ اور چوری کا بھانڈا کبھی نہ کبھی پھوٹ ہی جاتا ہے۔ اب ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ حکایت اخلاقی یا غیر اخلاقی ہوتی ہے لیکن محض حکایت کے لیے اخلاق کافی نہیں اس میں قصہ پن کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً "گلستان سعدی" یا اخلاق محسنی میں جن واقعات یا مکالموں کو حکایت کہا گیا ہے ان میں سے اکثر میں قصہ پن نہیں اس لیے ان پر لفظ حکایت کا اطلاق صحیح نہیں مثلاً "گلستان کے اردو ترجمے باغ اردو سے ملاحظہ ہو:

"ایک بزرگ نے کسی پرہیزگار سے پوچھا کہ فلانے عابد کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر اشخاص اس کے حق میں طعنہ آمیز باتیں کہتے ہیں۔ کہا اس نے کہ بظاہر اس میں کچھ عیب نہیں دیکھتا اور باطن سے اثر آگاہ ہے"

اسے خواہ ایک مکالمہ کہیئے خواہ ایک واقعہ اس میں قصہ پن کا نام نہیں محض ایک شریفانہ قول ہے اسے اور اس قبیل کی دوسری چیزوں کو حکایت کے زمرے میں کیونکر شامل کر سکتے ہیں اس مفصل جانچ پڑتال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حکایت ایک بہت مختصر اور سادہ کہانی ہے جس میں ایک بہت چھوٹا واقعہ بہت کم کرداروں کے ذریعے بیان کر دیا جاتا ہے۔ اکثر یہ کردار حیوان ہوتے ہیں۔ حکایت کی غایت تفریح نہیں بلکہ کسی نہ کسی شکل میں اخلاقی اصلاح اور بدی کی مذمت ہوتی ہے اس میں رنگینی اور رومان کے نشاط و سرور کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی:

داستان کے بارے میں ہمیں کسی قدر تفصیل سے غور کرنے ضرورت ہے۔ اردو کی مشہور داستانیں یہ ہیں۔ قصۂ حسن و دل۔ قصۂ ملک محمد و گلشن افروز۔ چار درویش۔ حاتم طائی۔ گل بکاولی۔ گل صنوبر۔ فسانۂ عجائب۔ سروش سخن۔ طلسم حیرت۔ داستان امیر حمزہ۔ بوستان خیال۔ مختصر داستانوں کے مجموعوں میں طوطا کہانی۔ سنگھاسن بتیسی اور بے تال پچیسی ممتاز ہیں۔ الف لیلیٰ میں مختصر داستانیں بھی ہیں اور متوسط یا طویل داستانیں بھی۔ ان سب میں کہیں نہ کہیں فوق فطری عناصر کی کارفرمائی ملتی ہے۔ جس سے غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ یہ جزو لاینفک ہی داستان

کا امتیازی رنگ ہے لیکن جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا یہ داستان کی حیثیت کا جزو نہیں۔ چار درویش کی بہترین داستان پہلے درویش کی سیر ہے اس کے انجام میں سبز پوش سوار کے ظہور کے علاوہ کہیں کسی دیو و پری۔ سحر و طلسم کا مذکور نہیں۔ الف لیلہ میں سوتے جاگتے کی کہانی میں بھی فوق فطرت کا کوئی شائبہ نہیں۔

داستانوں میں ایک اور قدر مشترک حسن و عشق کا عنصر ہے۔ کیا اسی کو داستان کا مابہ الامتیاز قرار دیا جائے۔ حسن کا آفاقی اور دوامی جذبہ یقیناً داستان کا ایک اہم عنصر ہے لیکن اسے بھی ناگزیر نہیں قرار دیا جا سکتا مثلاً الف لیلےٰ میں سندباد جہازی۔ سوتے جاگتے کی کہانی یا علی بابا چالیس چور میں حسن و عشق کا کوئی ذکر نہیں۔ سندباد اور علی بابا ایسے قصے ہیں جو بجائے خود آزاد اور مکمل داستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آرائش محفل کے پانچویں سوال حاتم کے جانے اور کوہ ندا کی خبر لانے میں بھی کہیں کوئی معاشقہ نہیں ہوتا۔

معلوم ہوتا ہے ایسا کوئی سررشتہ نہیں جو تمام داستانوں کو منسلک کرتا ہو ان میں یک رنگی نہیں بوقلمونی ہے پھر بھی ہم داستانوں کو حکا یا جدید ناولوں سے الگ شناخت کر سکتے ہیں۔ یعنی ہمارے ذہن کے کسی گوشہ میں اس صنف کے خدوخال کا کوئی نہ کوئی شعور یقیناً موجود ہے۔ مغرب میں داستانوں کو رومانس کہا جاتا ہے یہ کلیدی لفظ ہی داستان کی کماحقہٗ نشاندہی کرتا ہے۔ داستان ہمیشہ رومانی اور غیر اصلی ہوتی ہے۔ جو لوگ رومان کے معنے محض حسن و عشق سمجھتے ہیں ان کی معصومیت پر درگزر کیا جا سکتا ہے۔ رومان خیالی جذباتی فقرہ ہوتا ہے۔ جذبات انسانی میں جذبۂ عشق سب سے شدید ہوتا ہے لیکن یہ سب کچھ نہیں۔ رومان کا عشق سے گہرا تعلق ہے لیکن حسن و عشق کی قید سے آزاد ہو کر بھی رومان لکھے جا سکتے ہیں۔ شاعری کی دنیا سے دو مثالیں ملاحظہ ہوں

اقبال کی نظم ایک آرزو جس کی ابتدا یہ ہے:

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

اور کلیات نظیر اکبرآبادی کی مثنوی "سیر دریا" جس کا خاتمہ یوں ہے

دل نے یوں چاہا کہ اب رہیے یہیں — خلق میں کہلائیے صحرانشیں
چھوڑیئے دانش کی خوش اسلوبیاں — دیکھیے دیوانہ پن کی خوبیاں
بے محابا شادمانی کیجیے — بے تکلف زندگانی کیجیے

ہر طرح سے رومانی نظمیں ہیں لیکن انہیں عشق سے دور کا لگاؤ نہیں۔ رومانی داستانوں میں ایک خیالی دنیا خیالی واقعات کا بیان ہوتا ہے اس پر تخیل کا رنگین قرمزی بادل چھایا رہتا ہے۔ اس میں کوئی فوق فطری مخلوق نہ بھی جلوہ آرا ہو تب بھی اس میں جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں جو حقیقی سے زیادہ تخیلی ہوتے ہیں۔

ماذق الفطرت کی تحیر خیزی۔ حسن و عشق کی رنگینی۔ مہمات کی پیچیدگی۔ بیان کا لطف انہیں عناصر سے داستان عبارت ہے ایک دل کش کیفیت لیے دل کیفیت اور اس کے بعد ایک فرحت آسودگی کا احساس داستان کی خصوصیت۔ داستان گو کا تحفہ ہیں کچھ لمحے ہنس کھیل گزار دینا کچھ گھڑیوں کے لیے اس علت و معلول کے جہاں شعار نظام سے چھٹکارا پا لینا۔ غرضکہ داستان کی غایت اصلی تفریح ہے گو بظاہر اس میں ایما کی ترغیب دی جائے لیکن یہ دین داری محض ایک بھرم ہے۔ داستان کا مصنف واعظ اور ناصح نہیں ہوتا اس میں زہد کی خشونت اور خشکی نہیں جاتی وہ خیالی طبقے کا قائل ہے۔ اس کا وار عقل سے زیادہ دل پر ہوتا ہے۔ وہ فکر سے زیادہ جذبہ کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ جب کہ حکایت میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔ حکایت میں ایک بوڑھا بچوں سے خطاب کرتا ہے۔ داستان میں ایک مست شباب دوسرے مستان شباب کے سامنے تانیں اڑاتا ہے۔ حکایت نویس ایک حکیم بزرگ ہوتا ہے۔ داستان کا راوی ایک اندخانہ سوز ہے۔

اس مضمون کی ابتدا میں چند ایسی مختصر داستانیں درج کی گئیں جو طول میں حکایت سے زیادہ نہیں۔ ان میں داستانوں کی مخصوص فضا پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ طول اور ضخامت داستان کا بنیادی عنصر نہیں لیکن اس اجمال میں داستان کا رنگ روپ اجاگر نہیں ہونے پاتا۔ مہمات کا تواتر۔ پیچیدگی۔ شش و پنج۔ استعجاب اور اضطراب۔ یہ بھی داستان کے اجزا ہیں اور یہ سب اطناب ہی میں رونما ہو سکتے ہیں۔ اس لیے عرف عام میں داستان کا اطلاق محض طویل داستانوں پر ہوتا ہے۔ رواج عام کو آسودہ کرنے کے لیے ہم مختصر داستانوں کو داستان نہ کہہ کر رومانی کہانیاں کہہ سکتے ہیں۔ کہانی چونکہ کہی جاتی ہے اس لیے وہ شیطان کی آنت نہیں ہو سکتی۔ رومانی کی صفت لگا کر ہم ایک طرف ان کہانیوں کا داستان سے رشتۂ اتحاد ظاہر کرتے ہیں تو دوسری طرف ان ہی حکایات سے بھی کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہم داستان کی اصطلاح کو طویل قصوں تک محدود کر دیتے ہیں۔ داستان اور رومانی کہانی میں ناول اور جدید مختصر افسانے کا سا رشتہ ہے۔

اردو کے قدیم افسانوں کی موٹے طور پر یوں تقسیم کی جا سکتی ہے

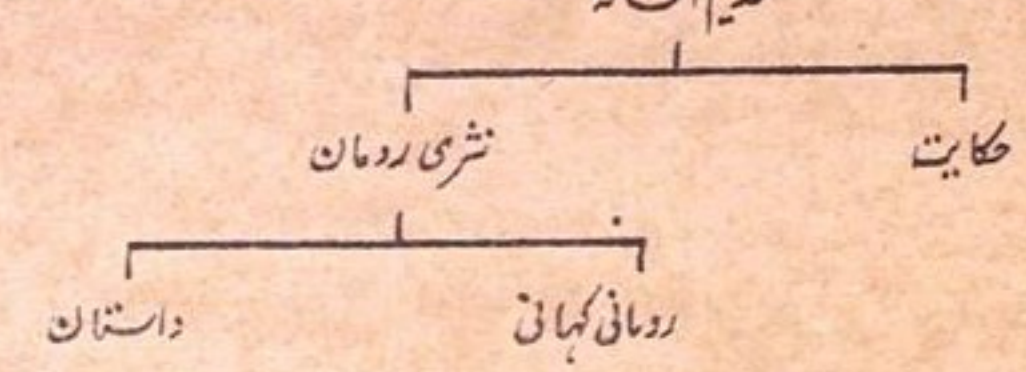

حکایت کے بہترین نمونے کلیلہ و دمنہ میں اور طوطا کہانی کی بعض کہانیوں میں ہیں۔ رومانی کہانیوں کی نمائندگی سنگھاسن بتیسی، بے تال پچیسی اور طوطا کہانی کی بیشتر کہانیوں سے ہوتی ہے۔ داستان کے سب سے اچھے نمونے باغ و بہار اور داستان امیر حمزہ ہیں۔

داستان اردو ادب کی سب سے موہنی صنف ہے۔ غزل جو شاہوں کے ایوان اور شاہ صاحبان کے نیکوں کی رونق محفل ہونے کی مدعی ہے۔ گیرائی میں داستان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ داستان کیا ہے ملکہ بہار کا جادو ہے کہ جس پر اس کا گلدستہ چل گیا وہ ہاتھ باندھ کر عاشقی کا دم بھرنے لگا۔

نگار رامپور

کے بارے میں یہ عام غلط فہمی ہے کہ اس کا تعلق نگار پاکستان سے ہے اور یہ اسی کا چربہ ہوتا ہے ہم ان دونوں باتوں کی پرزور تردید کرتے ہیں" نگار رامپور کا کوئی تعلق نگار پاکستان سے نہیں اور اس کے مضامین بھی بالکل علیحدہ ہوتے ہیں۔

نگار پاکستان کی خریداری کے لیے آپ منیجر نگار پاکستان ۳۲ گاندھی گارڈن مارکیٹ کراچی ۳ کے پتے پر لکھیے

نگار رامپور کی خریداری کیلئے نگار بک ایجنسی رامپور سے رجوع کیجئے۔

منیجر نگار رامپور

دلیسی کا خط پردیسی کے جواب میں

عطا محمد شعلہ

(محترمی مجنوں گورکھپوری سے مغدرت کیساتھ)

۵ مئی ۱۹۶۲ء پیاری گلنار۔ ابھی ابھی میرا چپراسی ڈاک لایا تو سب سے پہلے مجھے جس کی تلاش ہوئی وہ تمہارا محبت نامہ تھا۔ ادھر ایک ہفتے سے زیادہ اسی بے چینی میں گذر گیا کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ سوچا پتہ نہیں کیا بات ہے۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے سماتے رہے۔ اور بدگمانیوں کا ایک طویل انبار جمع ہوتا گیا۔ میرا چپراسی بھی کچھ کم ذہین نہیں ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ صاحب بہادر کسی خط کے منتظر ہیں۔ اور وہ بھی کسی ایسی ہستی کے خط کے جس سے ان کا سرکاری واسطہ نہیں بلکہ تن اور من کا واسطہ ہے۔ آج تمہارا گلابی حاشیے کا لفافہ ڈاک میں دیکھتے ہی وہ کم بخت سب کچھ تاڑ گیا۔ آتے ہی بولا کہ صاحب بہادر مبارک آج بیگم صاحبہ کا خط ڈاک میں ہے۔ اس کو کیا پتہ کہ میری زندگی میں یہ کتنی بڑی کمی ہے۔ خدا اُس کی زبان مبارک کرے۔ مگر سچ کہو تم ایسی بات کا برا تو نہ مانو گی؟ ہاں خیر چھوڑو اس بات کو۔ جب کبھی ملاقات ہوگی تو اس باب میں بھی تمہارا فیصلہ معلوم ہو جائے گا۔ معاملہ جب تمہاری ماں اور بہن ہی پر موقوف ہو تو مجھے اس کی فکر بھی نہ کرنا چاہیئے۔ تم اتنی ذہین اور سمجھدار ہو کہ مجھے اس بارے میں کسی ایسے فیصلہ کا شبہ رہ ہی نہیں گیا ہے جو میرے اور تمہارے مفاد کے خلاف جا سکے۔

مگر یہ کیا؟ گلنار قسم ہے پیدا کرنے والے کی کہ میں تمہاری ذہانت کا قائل ہو گیا اور اس بھیانک تنہائی میں بھی جو ڈاک بنگلہ کی خصوصیت ہوتی ہے لطف آگرہ گیا۔ ہاں بھئی کچھ تو بتاؤ کہ یہ "پردیسی" کون ہیں؟ اور کہاں سے ٹپک پڑے؟ اور یہ کیوں تم پر اتنے ریجھے ہیں کہ ناول کے ناول تیار کر کے تمہاری طبیعت کو منغض کر رہے ہیں؟ یہ بھی عشق کا اچھا طریقہ ہے کہ مختلف ادیبوں اور شاعروں پر گفتگو کر کے اپنی جنسی آسودگی کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ اُن کے خطوط کا ایک طویل پشتارہ جو تم نے میرے پاس بھیجدیا ہے یہ بہت ہی اچھا کیا ہے۔ فرصت کے لمحات اب آسانی سے گزر جائیں گے۔ تم جانتی ہو کہ جب تنہائی بہت ستانے لگتی ہے تو ہم کو وہ لوگ بھی عزیز معلوم ہونے لگتے ہیں کہ جو عرف عام میں بور (Bore) کہلاتے ہیں۔ اس لیئے ایسے وقت کسی کی رفاقت کا ہاتھ آجانا اور ان کٹھن گھڑیوں میں دل بہلانے کا ایک ذریعہ پیدا ہو جانا بھی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتا۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تمہیں یہ سوجھا کیا؟ کہیں گلنار اور کہیں یاسمین؟ ایک پیکر ناز کے دو نام! نام پر تو مجھے اعتراض نہیں۔ تم چاہو تو ان گنت نام اختیار کر لو۔ حسن کی ایک نہیں لاتعداد شکلیں بھی ہو سکتی ہیں۔ اور اسی نسبت سے لاتعداد نام بھی۔ مگر حسن کا اصلی نام صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور وہ ہے حُسن۔ مختلف اوقات میں مختلف کیفیات اور خارجی روابط کی بناء پر نام بدلتے رہتے ہیں۔ یوں تمیز اور تشخص کی خاطر ماں باپ کا مجوزہ نام پیدائش سے تادم مرگ لیبل کی طرح چپک کر رہ جاتا ہے۔ مگر خدا کے لیئے میرے ساتھ بھی یہی کھیل نہ دُہرا دینا۔ تم میرے لیئے گلنار ہو اور گلنار ہی رہو گی۔ یاسمین نام میں کچھ زیادہ سنجیدگی اور زیادہ عمر رسیدگی کا انداز ملتا ہے۔ مگر پردیسی جی بھی تو شاید اب لگ بھگ ساٹھ کے ہو رہے ہیں۔ اس خیال سے انھیں اگر اپنا نام تم نے یاسمین ہی بتا دیا ہو تو کچھ برا بھی نہیں۔

ہندو دیو مالا میں ایک چیز ہوتی ہے مایا۔ بھگوان کی مایا اپار ہے۔ وہ جب چاہیں جو روپ اختیار کر لیں۔ اور جس طرح چاہیں اپنے بھگتوں کا امتحان لیں یا انھیں اپنے درشن دیں۔ مسلمانوں کے یہاں بھی یہ تصور ہے۔ مگر ذرا مختلف انداز میں۔ ہم لوگوں کے یہاں صرف شیطان مختلف روپ اختیار کر کے خدا کے بندوں کو بہکایا کرتا تھا۔ بعد میں صوفیہ نے مشائخ دین کے ساتھ لگ بھگ مایا جیسا تصور دابستہ کر دیا مگر اسلامی فلسفہ میں اس چیز کا کوئی نام نہیں ملتا ہندوؤں نے اس کو ایک خوبصورت نام مایا کا دیا ہے۔ اور اس تصور کے ساتھ کچھ ایسی حسین روایتیں دابستہ کر دی ہیں۔ اور اس کی بنیاد پر اپنی دیو مالا کی وہ عظیم الشان عمارت تعمیر کی ہے۔ کہ یہ اک نہایت ہی دلچسپ اور مفید مطلب فلسفیانہ تصور بن کر سامنے آگیا ہے۔ میں اس فلسفہ کا بالکل قائل نہ تھا۔ مگر

آج آنکھیں کھل گئیں۔ تم نے اداکاری کا وہ پینترا دکھایا ہے کہ کیا کہوں!

ہاں تو گلنار۔ یہ تمہارے پردیسی جی تو کوئی بڑے سرکاری افسر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا چپراسی روزانہ گاڑی سے ان کے بیوی بچوں کی خیریت معلوم کرنے جاتا ہے۔ اور تمہارے بیس بیس صفحوں والے خط انھیں لاکر دیتا ہے۔ یہ کیا کر رہی ہو غریب کو بیس بیس صفحات کے خط لکھ رہی ہو۔ مجھ کو تو کبھی تم نے دس لائن سے زیادہ کا خط لکھا ہی نہیں۔ اگر ان حضرت کی بیوی کے لئے تمہارا کوئی خط کہیں پڑ گیا تو ان کی کیا گت بنے گی؟ اس پر بھی کبھی کچھ سوچا ہے؟ مگر شاید یہی سوچ کر تم اس قدر طویل خطوط انھیں لکھتی ہو کہ کسی نہ کسی دن یہ راز اسی طرح کھل جائے۔ اور ان حضرت کی انھی خاصی تواضع ہو جائے۔

ہاں ان حضرت پردیسی جی کی انا بھی غضب کی ہے۔ یہ جہاں رہے وہاں بے انتہا آبادی ہو گئی اور بار دنیق خطے بن گئے۔ جن کی روح رواں یہی حضرت رہے۔ انھیں اکبر کا کلام اس لئے یاد نہیں تھا کہ وہ کوئی یاد رکھنے کی چیز تھی بلکہ اس لیئے کہ انھیں اپنے حافظہ پر ناز تھا۔ اسی مشق ناز کے لیئے اکبر الہ آبادی کے کلام پر بھی ان کی نظر عنایت ہو جاتی تھی۔ ان کو یہ بھی احساس ہے کہ وہ بڑی توانائیوں کے مالک ہیں۔ مگر جب تم ان کی تخلیقی توانائیوں پر فریفتگی کا اظہار کرتی ہو تو ان حضرت کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ کیوں کہ ان کے بقول وہ عملی اور خارجی زندگی جو ان کے نصیب میں ان کی تخیل کے ساتھ ہمیشہ برسرپیکار رہی۔ مگر آخر کار تمہاری جادوگری کے وہ بھی قائل ہوئے۔ اور مان لیا کہ تمہارے کاٹے کا منتر نہیں۔ فرماتے ہیں کہ ان کو سانپ کاٹا سمجھا جائے جس کو ابھی لہریں تو آرہی ہیں مگر جس کو کوئی منتر نہیں بچا سکتا۔ اتنے پر بھی کچھ نہیں سمجھیں۔ میں تو محض اتنا کہوں گا۔

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

دیکھا تم نے یہ مومن خاں ہیں۔ عشق بازی کے کامیاب ترین فن کار۔ خانوادۂ داغ کے باوا آدم۔ یوں تو کہنے کو داغ ذوق کے شاگرد تھے مگر وہ معنوی چیلے ہیں مومن خاں کے۔ اگرچہ مومن کی سطح سے کچھ نیچے اتر کر انھوں نے اپنی فن کاری کا مظاہرہ کیا۔ مگر پھر بھی دل کی آنچ سے اپنے انداز شاعری کو کچھ ایسی گرمی عطا کی کہ بازاری ہوتے ہوئے بھی یہ شرفاء کا دل للچا ہی گئی۔ اور اپنے لیئے ایک مستقل مقام پیدا کر گئی۔ مگر بات تو پردیسی جی کی ہو رہی تھی۔ اور ان کے سلسلے سے اکبر الہ آبادی کا ذکر تھا۔ عبدالماجد دریا آبادی بیچ میں آگئے۔ دو چار بے نقط انھیں بھی سننا ہی پڑیں۔ اگرچہ عبدالماجد دریا آبادی کے بارے میں میں پردیسی جی کی رائے سے متفق ہوں۔ وہ غریب نثر کا نہیں نظم کا آدمی تھا۔ شاعر ہوتا تو اس کا دل ٹوٹ کر کسی پر آگیا ہوتا۔ اور وہ ایسی رومانی اور جذباتی شاعری کرتا کہ اللہ غنی۔ حالانکہ اس کا انجام بھی بخیر نہیں ہوتا۔ تان آخر میں مایوسیت اور شکست پر ٹوٹتی۔ ایسوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اس دنیا میں نہ جانے ایسے کتنے تماشے ہو چکے ہیں۔ دور کیوں جائیں اپنے پردیسی جی کو ہی دیکھ لو۔ جہاں تک مجھ اندازہ ہوتا ہے دنیا نے ہو سکتا ہے ان کی تمناؤں کی حد تک انھیں نہ ٹوکا ہو۔ مگر ان کی استعداد تک تو ضرور نوازا ہے۔ مگر پھر بھی حضرت شاکی ہیں ایک زمانے کے۔ رو رہے ہیں۔ حسہ بسور رہے ہیں۔ دنیا کو گالیاں دے رہے ہیں کہ میں بڑی توانائیوں کا مالک تھا۔ اس دنیا کی چکی میں میری توانائیاں پس کر رہ گئیں۔ حال حضرت کا یہ ہے کہ۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کبھی آپ پر شوپنہار اور دوسرے کلبی قسم کے غم پسندوں کا غلبہ تھا۔ کبھی آپ بھوت پریت اور سمریزم کے قائل تھے۔ اور اپنے افسانوں سے تمام دنیا کو اس کا قائل کرنا چاہتے تھے۔ کبھی آپ اشتراکی بنے تو دنیا کے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑے کہ سب اشتراکی کیوں نہیں بن جاتے۔ پتہ نہیں آج یہ کون سی کیفیت ہے۔ جس پر اپنی عملی صلاحیتوں کے ضائع ہو جانے کا ماتم کر رہے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ یہ دنیا ان کے غم میں شریک ہو کر مجلس عزا میں تبدیل ہو جائے۔ اور بگڑ رہے ہیں اکبر پر۔ جس غریب نے دنیا کو مرتے دم تک ہنسایا اور اس طرح دنیا کے غم مٹائے۔

آپ کو شکایت ہے کہ اکبر کے یہاں فکر و نظر کی متعین بحث نہیں ملتی۔ وہ اکبر کو کم دبیش تنگ خیال۔ حاسد اور کینہ پرور بناتے ہیں۔ اور اسی سانس میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ۔

"اکبر اردو شاعری میں پہلے شخص ہیں کہ جنھوں نے مزاح اور ظرافت کو معاشرتی اور اخلاقی تنقید اور تدریس کا ذریعہ بنایا۔ ان کی مزاح

شاعری ایک مقصد لیئے ہوتی ہے۔ انھیں شکوہ ہے کہ اکبر مغربی تہذیب کی اچھائیوں اور مشرقی تہذیب کی برائیوں پہ نظر نہیں رکھتے۔
ان کو ایک رٹ ہے کہ مغربی تہذیب خراب ہے"!

اب تم ہی کہو کہ کیا وہی عیب جو ہمارے پردیسی جی عبدالماجد صاحب مدیر آبادی میں پاتے ہیں۔ خود پردیسی جی کے انداز نظر میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اکبر کوئی فلسفی یا معاشیات کا ماہر یا حکیم تو تھا نہیں جو وہ ایک مفصل کتاب لکھتا اور بتاتا کہ مغربی تہذیب میں کیا خرابی ہے اور مشرقی تہذیب میں کیا خوبی ہے۔ وہ یقیناً مغربی تہذیب کی خوبیوں کے قائل تھے ورنہ اپنی اولاد کو جدید مغربی تعلیم کی آخری منزل تک نہیں پہونچاتے اس کے ساتھ ساتھ وہ مشرقی تہذیب کے کام کے اجزاء کو یکسر چھوڑ دینا نہیں چاہتے تھے۔ اور اسی لیئے انھیں اپنے اندازے کے مطابق دونوں میں جہاں بھی کوئی خامی نظر آتی تھی اس کا خاکہ اڑانا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف مغرب زدہ طبقے پر طنز و تعریض کرتے ہیں بلکہ اگلے وقتوں کے شیخ و ملا پر بھی پھبتیاں کستے رہتے ہیں۔ اب پردیسی جی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تو لگے پوچھنے کہ ان استفسار کی بحث کیا ہے؟۔ اور اُن سے ہماری کیا رہنمائی ہوتی ہے؟۔ مثلاً۔

ہند میں شیخ رہ گیا افسوس اونٹ گنگا میں بہہ گیا افسوس

اس شعر کا مطلب صاف ہے کہ اسلامی تعلیم میں جو ایک قلندرانہ بے نیازی، بے جا رسومات کی بیخ کنی، اور ماسوا اللہ کے کسی غیر کی اطاعت کا انکار ملتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے درمیان سے غائب ہو گیا۔ اور یہاں صرف نام کے شیخ ہی رہ گئے۔ گنگا کی لہروں میں ایک عجیب انجذابی کیفیت ہے۔ زمانہ قدیم سے جتنی تہذیبیں اور قومیں ہندوستان میں آئیں بالآخر ہندو تہذیب میں جذب ہو گئیں۔ رہ گئے تو صرف ایک شیخ جی جو علی حد تک توجذب ہو گئے مگر نام کے لیئے ابھی علیحدہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اونٹ ایک علامت ہے قلندرانہ صبر و قناعت آس اور جذبہ عمل کی جو اسلام کی تعلیم کا جزو خاص ہے اسی طرح مجنوں اور لیلیٰ کی ماں کے درمیان ایک گفتگو جو قلم بند کی گئی ہے۔ اور جس میں مجنوں کو ایم۔ اے پاس کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اس نظم سے پردیسی جی یہ نتیجہ نہیں نکال سکے کہ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے۔ شاعر صاف کہہ رہا ہے کہ زمانہ اور زمانے کی ہوا بدل گئی۔ اور اب جدید تعلیم کے بغیر اور اس سے ہم آہنگی کے بغیر زندگی کے مختلف خانوں میں کوئی سانچہ فٹ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ رشتۂ ازدواج کے لیئے بھی دقتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کی واضح تعبیر آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اکبر نے کتنے پہلے کہا تھا کہ۔

لے لیا شیریں نے کمریٹ میں ٹھیکہ دودھ کا ریل بنوانے لگا فرہاد اب کہسار کی"

یہ زندگی کا وہ واضح اور عملی خاکہ ہے جو ہر قدم پر ہمارے سامنے ہے۔ اکبر نے اگر اب سے بہت پہلے اس کا نقشہ پیش کر دیا تھا تو یہ تو ان کے دور میں دماغ کی ایسی کارگزاری تھی جس پر ہم ان کی جتنی بھی تعریف کریں کم ہے۔ آج مثالی فرہاد کے لیئے دنیا میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ موجودہ سماج میں کوئی بھی بلا کمائے کھانے کا حق دار نہیں ہے۔ زمانہ اور زمانے کی روش اس تیزی سے بدل رہی ہے کہ اب سے دس برس بعد شاید ہر گھر میں ہر فرد کو کمانا پڑے۔ شہروں میں تقریباً یہ پوزیشن آ چکی ہے۔ قصبات میں آ رہی ہے اور دیہات میں آنے والی ہے۔ پورے سماج کا ڈھانچہ بدل رہا ہے۔ اور بدل جانے کے بعد سماج کا ڈھانچہ کیا ہو گا وہ آج اہل نظر ہی کو نہیں عوام الناس کو بھی نظر آ رہا ہے۔

اکبر کے سلسلہ میں پردیسی جی کا ارشاد ہے کہ " میں نے کبھی ہجو، استہزاء، اور طنز و تضحیک کو صحت بخش صورت کا اظہار نہیں سمجھا۔ مصوری میں ہو یا ادب میں، میں نے طنز و تضحیکات کو ہمیشہ ادنیٰ درجے کی تخلیقات سمجھا"۔ ایک عجیب و غریب قسم کا دعویٰ معلوم ہوتا ہے۔ بھلا گلنار۔ تمہیں بتاؤ کہ کیا کوئی ایسا انسان ہے جو منہ چڑانے کو قدرتی سبھاؤ پر ترجیح دے۔ مگر اس سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ بعض اوقات منہ چڑھا کر انسان خود اپنے بگاڑے ہوئے چہروں کو قدرتی وضع پر واپس لانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اکبر کی شاعری نے یہی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اور اس طرح انھوں نے ایک زبردست سماجی کارنامہ انجام دے کر اپنی تاریخی اہمیت کو منوا لیا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب مغرب زدگی کا سیلاب ہمارے مشرقی اقدار کو اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہائے لیئے جا رہا تھا۔ اور اس کا خطرہ تھا کہ میکالے (Macaulay) کا خواب کہ ایک ایسی قوم پیدا کی جائے کہ جو محض دفتروں میں کلرکی کیا کرے۔ اور جس میں غلامانہ ذہنیت کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے۔ اپنی تعبیر سے روشناس

ہونے والا تھا کہ اکبر اپنے طنز و مزاح کے کاری نشتروں اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان شاعری میں کود پڑے۔ اور انھوں نے اعلان کیا۔

کیا کہیں احباب کیا کارنمایاں کر گئے — بی۔ اے کیا۔ نوکر ہوے پنشن ملی اور مر گئے

اکبر کی شاعری مغرب کی ظاہری نقالی کے خلاف ایک محاذ ہے۔ یہ ان مغرب زدوں کے خلاف ایک اعلان جنگ ہے جو پڑھ لکھ کر باقی ہندوستانیوں کو کالا آدمی سمجھنے لگے۔ جو کوٹ پتلون کی ادا کے ایسے پرستار تھے کہ کرتے اور پاجامے اور شیروانی کا استعمال خلاف تہذیب سمجھنے لگے تھے اور انھیں دقیانوسی چیزیں ماننے لگے تھے۔ جو مشرقیت سے ایک دبائی مرض کی طرح گھبرا کر اپنی مادری زبان کو انگریزوں کی نقل میں بگاڑ کر بولنے لگے تھے۔ فرماتے ہیں۔

آگاہ ہوں معنیٔ خوش اقبالی سے — واقف ہوں بنائے رتبۂ عالی سے
شرطیں عزت کی اور ہیں اکبر — چلتا نہیں کام صرف نقالی سے

انھیں مغرب کی روح عمل کا پورا احساس تھا۔ اس روح عمل اور مغرب کی علمی لگن کی ان کے دل میں بہت عزت تھی وہ اپنے زمانے کے بڑے ترقی پسند لوگوں میں تھے۔ وہ اشیاء کی ماہیت اور جدید علوم کی افادیت پر خاص نگاہ رکھتے تھے۔ دیکھیئے کوآپریٹو تحریک پر (cooperative movement) کیا خوب کہا ہے۔

خواہش ہے اگر تجھے غنی بننے کی۔ — دولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی
شخصی حالت کو چھوڑ کر اے ضدی — کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

میں نے مانا کہ کوآپریٹو تحریک کا اتنا واضح خاکہ جو آج ہے۔ ان کے دماغ میں نہ تھا۔ مگر چند انسانوں کی مجموعی کوششوں اور مشترکہ سرمایہ سے ایک کمپنی بنا کر تجارت کے میدان میں سرمایہ کمانا اور انفرادی تجارت پیشہ لوگوں سے بازی لیجانے کا طریقہ انھیں معلوم تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کا کتنا گہرا شعور انھیں حاصل تھا وہ ان اشعار سے ظاہر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں طنز و مزاح کا شاعر مان لینے کے بعد ان کے اشعار کے اس رخ پر کسی کی نگاہ جا ہی نہ سکی۔

گلنار۔ مجھے تعجب ہے تو اس بات پر کہ پردیسی جی جن کی تنقید کا بصیرت کی تم معترف ہو، خطوط میں کچھ عجیب چوں چوں کا مربہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور ہر نئے پیراگراف پر پچھلے پیراگراف میں دی ہوئی رائے کے خلاف اک نئی راہ کا اظہار فرماتے ہیں۔ وہ اکبر کو اردو شاعری میں سب سے بڑا حیوان ظریف بھی مانتے ہیں۔ ان کی شاعری کو معموری بھی کہتے ہیں۔ ان کو اردو کا سب سے بڑا مزاحیہ شاعر بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ طنز و مضحکات کو ادنیٰ درجے کی تخلیق سمجھتے ہیں۔ اس لیئے ظاہر ہے کہ اکبر کو لائق اعتبار بھی نہیں سمجھتے اور پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے یہاں فکر و نظر کی کوئی متعین سمت نہیں ملتی۔ وہ اکبر کو سرسید اور علی گڑھ تحریک کے خلاف رجعتی میلان کا سرگروہ بھی کہتے ہیں۔ ہر جگہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اکبر الہ آبادی۔ عبدالماجد دریا آبادی۔ مرثیہ و غزل اور اردو شاعری ان سب کا ذکر تو محض برائے بیت ہے۔ ذکر مقصود ہے اک ذات بزرگ برتر کا جو ذہانت و خلاقت کی اعلیٰ ترین معراج پر ہے۔ جو ہمہ وقت ہر شے کا ادراک رکھتی ہے۔ ہر علم و فن میں حاوی ہے۔ اور علوم جدید و قدیم جس کی گرفت میں۔ اور وہ ہے خود پردیسی جی کی ذات جس کا مکمل عرفان خود انھیں ہی حاصل نہیں ہے۔ اس لیئے وہ اپنے ماضی و حال اور مستقبل پر ہر وقت غور فرماتے رہتے ہیں۔ اور تم اگر انھیں یوں ہی خط لکھتی رہیں تو شاید وہ اپنی زندگی کا ثبوت دے سکیں۔ اللہ غنی۔ معرفت کی یہ کون سی منزل ہے کہ خود اپنے زندہ ہونے کا یقین نہیں ہے؟ مجھے تو ڈر ہے کہ اگر تم اسی طرح چھیڑ کرتی رہیں تو غریب کہیں اگر خودکشی نہ کر بیٹھے۔ مگر جاٹ مرا جب جانیئے جب تیرھیں ہو جائے۔ مرتے مرتے بھی یہ بہت سے شاعروں اور ادیبوں کے متعلق اک عام بدگمانی تو پیدا کر ہی جائیں گے۔

حضرت کی ادبی بصیرت جس کے وہ خود ہی ڈھنڈورچی بھی ہیں یہ پہچاننے سے قاصر رہے کہ اکبر نے اپنے دور کی معاشرت کو آئینہ دکھایا ہے اور وقت متنبہ کیا ہے کہ منہ بگڑتے بگڑتے کہیں خدوخال کی مسخ شدہ صورت ہی مستقل نہ ہو جائے۔ اس لیئے ہوش میں آؤ اور اپنے چہرے

بہرے کو فطری شکل و صورت سے قریب لانے کی فکر کرو۔ ہاں اس آئینہ کی سطح اتنی ہموار نہیں ہے۔ جتنی کہ ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ عکس کہیں کہیں اصل سے بھی زیادہ مضحک نظر آتا ہے۔ مگر یہی تو ایک طنز نگار کا صحیح آرٹ بھی ہے اور مقصد بھی۔ اکبر نے معاشرے کو کچھ زیادہ ہی مضحک بنا کر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ وہ عیوب جن پر ان کی نگاہ ہے زیادہ واضح طور پر سامنے آسکیں۔ اور معاشرے کی اصلاح ہو سکے رہا یہ کہ پردہ یا تعلیم نسواں اور دوسرے چند مسائل پر انھوں نے اس وسعت قلب و نظر کا ثبوت نہیں دیا جس کی آج کے مفکرین سے توقع کی جاتی ہے۔ تو میں اس سے بھی متفق نہیں ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ اکبر ہر مسئلہ پر ہماری ہی نظر سے دیکھتے وہ ایک خاص زمانے میں تھے اور جس زمانے میں اکبر تھے اس زمانے میں اس طرح سوچا ہی نہ جا سکتا تھا کہ جس طرح آج سوچا جا سکتا ہے۔ وہ معاشرے کی ایک سطح سے تعلق رکھتے تھے اور ایک خاص زمانے میں پیدا ہوئے۔ ان دونوں چیزوں کی اپنی حدیں اور اپنے تقاضے تھے۔ ان حد بندیوں اور تقاضوں کے پیش نظر جب ہم اکبر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کی عظمت، دور بینی اور ترقی پسند طبیعت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

مگر تم بھی کہو گی کہ خط کیا کیا ہے شیطان کی آنت ہے۔ اس لیئے سر دست اس بحث کو ختم کرتا ہوں اگرچہ یہ سمجھتا ہوں کہ اکبر پر بحث کا صحیح حق ادا نہیں کر سکا۔ اس کے لیئے میں نے سوچا ہے کہ ایک تفصیلی مضمون لکھوں جس کو کسی اچھے رسالے میں شائع کرا دوں۔ تاکہ اس طرح خطوط کو ذاتی دائرے تک محدود رکھا جا سکے اور ان میں زیادہ اچھی اور دلچسپ باتیں کی جا سکیں۔ خطوط اصل میں اس لیئے ہیں بھی نہیں کہ ان کے ذریعہ اپنے پندار علمی کو ظاہر کیا جائے۔ یہ دماغ کی باتوں سے زیادہ دل کی باتوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان میں صرف لطیف احساسات اور عمدہ جذبات ہی کی گنجائش ہے۔ یہ دماغی استفراغ کے لیئے اگالدان کا کام نہیں دیتے بلکہ یہ ایک دوسرے کی باہمی معرفت ذات کے لیئے نازک ترین آلے کا کام دیتے ہیں۔ جو ادب کی بارگاہ میں نصب کیئے گئے ہیں۔ آئندہ میں اس طرح کی بحث میں کبھی نہ الجھونگا۔

ہاں موقع ملے تو پردیسی جی سے کسی دن ملاقات کرا دونا! وقت ضرورت کام آنے والے لوگوں میں معلوم ہوتے ہیں!! ۔

زیادہ پھر کبھی۔ نہیں، نہیں اگلے خط میں۔

تمہارا اپنا

"دیسی"

نکات و رقعات

غالب کا ایک نادر مجموعہ

مرتبہ:۔ اکبر علی خاں

غالب نے یہ کتاب انگریزوں کو فارسی سکھانے کے لیے لکھی تھی۔ اور ان کی زندگی میں ہی اس کو حکومت کی جانب سے شایع کیا گیا تھا۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی تھی، جس پر غالب کو ایک بار گورنر کے دربار میں خلعت سے نوازا گیا تھا۔ اس غیر معروف کتاب کو اب تعارف اور ضروری حواشی کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔ کتابت و طباعت اور ترتیب و تہذیب کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اس لیے یہ کتاب ظاہر و باطن دونوں حیثیتوں سے صاحبان ذوق کی توجہ حاصل کرے گی۔ قیمت ڈھائی روپے

نگار بک ایجنسی رامپور۔ یوپی

شوکت ۔ ایک دوست اور ایک ساتھی

قاضی حیاذ انصاری

۱۹۴۰ء کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میں دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے بدل کر لکھنؤ پہونچا تو مرحوم سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ ان دنوں لکھنؤ اسٹیشن پر اتفاق سے کچھ ایسی شخصیتیں جمع تھیں جن میں باہمی یگانگت اور میل جول قائم تھا۔ نشریات میں کارگزار اچھے ہوں اور ان میں بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ یکجہتی اور وحدت خیال کا جذبہ بھی ہو تو یہ نشریات کے لئے فال نیک ہے اور پروگراموں کی بہتری اور نیک نامی کی ضمانت بھی۔ ہندوستانی نشریات کی تاریخ میں لکھنؤ اسٹیشن کی وہ ٹیم جو اس وقت وہاں کام کر رہی تھی، اپنی کارگزاری کے اعتبار سے بہت نیک نام ثابت ہوئی۔ ملک حبیب احمد، انصار ناصری عشرت رحمانی، کرشن سروپ ملک موجودہ ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل فرید اور شوکت یہ سب الگ الگ نام تھے۔ ایک ہی جذبے اور ایک ہی خیال کے۔ کام سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی ایک کو ان میں سے رات کے وقت کسی ضرورت سے اسٹوڈیوز کی حاضری ضروری تھی تو اس ایک کی طمانیت خاطر کے لئے سب ہی وہاں جمع رہتے۔ دفتری زندگی اور باہر کی زندگی میں ایسا تال میل پھر کہیں کسی اور اسٹیشن پر میں نے نہیں دیکھا۔ باہر کی زندگی میں یہ لوگ اس قدر یکجہت تھے کہ اس وقت تک کوئی نشست گرم نہ ہوتی جب تک سب کی موجودگی یقینی نہ ہو جاتی۔

شوکت ان محفلوں کی روح رواں تھے۔ ریڈیو کے اندر بھی اور ریڈیو کے باہر بھی۔ ان کے بغیر کوئی محفل کوئی مجلس جیسے مکمل ہی نہ تھی۔ وہ خود چار خور محض تھے۔ لیکن زندگی کا ایسا روپ دھارن کرتے اور جھوم جھوم کر ایسی نشیلی باتیں کرتے جیسے ابھی ابھی ساغر کسی سے چھوٹ پڑا ہو شراب کا۔ وہ عمر کے بھی اس نشیلے دور میں تھے جب انسان لہریا چال چلتا ہے تو بن پیے بھی لڑکھڑا لڑکھڑا کر بہک بہک کر چلنے میں اسے مزہ آتا ہے۔ بیٹھتے ہی وہ محفل کو گرم کر دیتے جیسے کسی نے اندھیرے میں یکایک بجلی کا قمقمہ روشن کر دیا ہو۔ پھر ایک سے ایک حسین شعر سن لیجئے۔ چٹکلوں، لطیفوں اور فقروں کا دریا بہہ نکلتا اور پھر ان میں یہ خوبی تھی کہ وہ چوکھے بھی تھے۔ کسی ایک کا پیچھا نہ لیتے۔ اب عیاز سے چھل کر رہے ہیں تو اب عشرت کی جان کو آرہے ہیں تو اب حبیب کی خبر لے رہے ہیں۔ انصار ناصری ان کے مشق ستم ہیں تو اب ملک صاحب کو گرا رہے ہیں۔ انھی میں ایک بزرگ جی۔ ایم۔ شاہ بھی تھے ان کے جی حضوری کردار کی مناسبت سے شوکت نے ان کا نام ہی "حضور" رکھ چھوڑا تھا۔ عشرت رحمانی کو پروفیسر کے خطاب سے شوکت بھی نوازا۔ اور میں سمجھتا ہوں، احباب میں آج تک وہ اسی نام سے معروف بھی ہیں۔ مجھے بھائی کا عطیہ بھی شوکت ہی کی طرف سے ہے۔ لکھنؤ اسٹیشن پر "بھائی" پھر اس قدر مقبول ہوا کہ آج بھی وہاں کے پرانے کارگزار مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔

شوکت کو ہزاروں اشعار یاد تھے۔ ہر طرح کے، ہر مضمون کے، وقت کے تقاضے کے ساتھ وہ شعر کو اس خوبی کے ساتھ پیوست کرتے کہ گھٹیا شعر بھی سناتے تو ان کی زبان سے اچھا ہی لگتا تھا۔ اس سلسلے میں شوکت کے خاص دوست مرحوم رفیع احمد خاں کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ وہ بزرگ ہیں جو صاحب دیوان نہ ہوتے ہوئے بھی اردو سے دلچسپی رکھنے والوں میں زندہ جاوید ہیں اور لطف یہ کہ بڑی بڑی سنجیدہ محفلوں اور مجلسوں میں ان کی پہونچ ہے۔ وہ اس صدی کے جعفر زٹلی ہیں، ہزلیات کے بے تاج بادشاہ۔ تضمین پر انھیں بلا کا عبور تھا۔ غالب کے سنجیدہ سے سنجیدہ شعر پر ایسی تضمین لگاتے کہ الامان الحفیظ۔ کچھ دیر کے لئے غالب کا شعر خود ان کا شعر معلوم ہونے لگتا۔ پھر فنی اعتبار سے کیا مجال جو وزن سے گرا ہو یا معنوی اعتبار سے شعر کی انفرادیت مجروح ہوئی ہو۔ شوکت ان کے چلتے پھرتے دیوان تھے جو کچھ خاں صاحب نے کہا، شوکت گرہ دے کر اسے محفوظ کر لیتے۔ خاں صاحب کی ہزلیات کو "نعوذ باللہ" شوکت الہیات کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ ان کی شوخیٔ طبع کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ محفل کی ضبط سماعت کا انھیں ایسا اچھا سلیقہ تھا، وقت کے تقاضے کا ایسا بھرپور تجربہ تھا اور پھر تنوع کے وہ ایسے ماہر تھے کہ گھنٹوں محفل کو گرم رکھتے نہ خود رکتے اور نہ سننے والے سنتے سنتے تھکتے۔ شوکت کے تکلم میں نرمی بھی غضب کی تھی۔ لوچ بھی بلا کا تھا۔ اس کے چبھتے فقرے بھی قہقہوں میں اڑ جاتے تھے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ شوکت سے کوئی گراں خاطر اٹھا ہو۔ تین سال سے کچھ زائد ان کے ساتھ لکھنؤ میں گزرے۔ دن میں ہر وقت کا ساتھ دفتر میں، اور راتوں کو اکثر محفلوں اور مجلسوں میں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی تکلف نہیں کہ میری ذات کے ساتھ شوکت ہمیشہ ایک طرح کی خصوصیت برتتے تھے جس میں بلا سعی و کوشش خود بخود ایک طرح کا

صحت مند حد تک فاصل قائم ہو گیا تھا۔ ہنسی مذاق کی باتوں میں بھی وہ اس تعلق کا خیال رکھتے تھے۔ دراصل میں ان سے اور وہ مجھ سے ریڈیو کی دفتری ملاقات سے کچھ زیادہ ہی واقف ہو چکے تھے۔ وہ تھانہ بھون کے رہنے والے اور دور کے سہی حضرت مولانا تھانوی سے ان کی عزیز داری مسلم۔ میں گنگوہ کا باشندہ اور حضرت گنگوہی کے خاندان سے میری نسبت۔ یہ ایسے لطیف پردے تھے جنھیں شوکت نے کبھی چاک نہیں ہونے دیا۔ ان پاکیزہ ہستیوں کا ذکر کر کے یہاں میں نے ایک طرح کا سوء ادب ضرور کیا ہے۔ لیکن شوکت کی سیرت میں ثقافتی قدروں کی جو بے سمجھی بے بوجھی شدت ملتی ہے وہ اس تذکرہ کے بغیر تشنہ تشریح رہتی۔ ایک روز میں اپنے گھریلو معاملات کی فکر میں گم اپنی کرسی پر دراز تھا کہ دبے پاؤں شوکت نے مجھے پیچھے سے آلیا۔ میرا دماغ اس پر کچھ ایسا بے لطف تھا کہ غیر ارادی طور پر میرا بازو دراز ہوا اور الٹے ہاتھ کا ہلکا سا چپت ان کے رخسار پر پڑ گیا۔ شوکت کے وقار کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اب میں ریڈیو اسٹیشن پر کہیں کا نہ رہتا لیکن اس کی انسان دوستی میرے اس حمق سے زیادہ موثر ثابت ہوئی۔ حضرت عیسیٰ کے ایک حقیقی پیرو کی طرح انھوں نے دوسرا کلہ بھی میرے سامنے کر دیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگے، بھائی! ایسی کیا مصیبت تجھ پر نازل ہے جس نے تجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ شرم سے میں پانی پانی تھا۔ انتہائی شکست خوردگی کے عالم میں بیٹھا میں شوکت کے مسکراتے چہرے کو تکتا رہا آج جب شوکت کی اس نیک مسکراہٹ اور اس نظر مودت پر غور کرتا ہوں تو قلب میں ایک طرح کا جذبہ عبادت پیدا ہوتا ہے اور سوچتا ہوں کہ بزرگوں نے مودت فی اللہ شاید اسی کو کہا ہو۔ میں نے شوکت سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو ان دو چار دنوں میں کسی سے بھی نہ کہہ سکا تھا۔ اور اب آپ سے بھی کیا پردہ ہے! لیجئے سن لیجئے! میری بھانجی کی شادی مقرر تھی اور میری بہن کو شادی کے لئے رقم کی ضرورت تھی اور میری مدد پر وہ پوری طرح حصر کئے بیٹھی تھی جوں جوں دن قریب آرہے تھے میری خلش بڑھ رہی تھی۔ دن رات میں اسی الجھن میں تھا۔ اپنی بے بسی کا احساس شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ رقم اتنی تھی کہ لکھنؤ بیٹھ کر اس کا بھیجا کرنا ممکن نہ تھا۔ میری زندگی ایسی خود فراموشی کے عالم سے گزر رہی تھی کہ میں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے قابل بھی نہیں تھا۔ شوکت نے سن کر قہقہہ لگایا اور کہا بس اتنی سی بات! چلو میں دلاتا ہوں جتنی رقم درکار ہے۔ میں نے کہا ایک ہزار کم سے کم، ہاں ہاں ایک ہزار۔ اپنے خاں صاحب کی جیب کاٹنی ہوگی وہ مجھے اٹھا کر رفیع احمد خاں صاحب کے پاس لے گئے اور دو تین روز کی پیروی کے بعد انھوں نے چھ سو روپیہ کی رقم کو آپریٹیو سے قرض دلا دی۔ شوکت کے تقاضا ان کی زندگی سے ہزاروں خود ساختہ داستانیں سنا سنا کر انھیں چلبلا الھڑ، بے باک، منہ زور، بے ضبط، بے ربط اور ان کی غیر ذمہ داری اور غیر سنجیدگی کے تذکرے کرتے رہیں گے لیکن میں اس انسان شوکت کا ذکر کر رہا ہوں جس نے میری اس کمزوری کا پھر کبھی کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ قریب سے قریب احباب حسیب اور فرید بھی آج تک اس راز سے واقف نہ ہو سکے۔ میں خود ہی آج بیس برس بعد بطور اظہار تشکر اور بہ سلسلہ استحسان اس کا ذکر کر رہا ہوں یوں اسی شوکت نے ایک مرتبہ اتنی ہی بڑی رقم کے لئے اپنے ایک دوست کی خاطر مجھے ضمانت میں پھانس لیا تھا اور آج بھی اس رقم کا کچھ حصہ پاکستان کے اس عزیز دوست کے ذمہ واجب الادا ہے۔ لیکن اس کی نہ مجھے کوئی شکایت ہے اور نہ شوکت سے کوئی گلہ۔ دوستوں کی خاطر شوکت سب کچھ کر گزرنے والے دوست تھے۔ اپنی جیب کو چھوڑ کر جو ان کے اختیار میں اور جو کچھ ہوتا اس سے کبھی نہ چوکتے تھے۔ دوستوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی شدت میں بھی ایک کیف ہے ایک چٹورپن ہے اور یہ ایسا نشہ ہے جس کی سرشاری میں بہک کر لڑکھڑا کر چلنا تو ایک طرف انسان گر کر چوٹ کھانے اور سر پھوڑ لینے کی بھی پروا نہیں کرتا۔ انسان کی ساری بے باکیاں غیر سنجیدگیاں غیر ذمہ داریاں اور دل آزاریاں اپنی ذات سے زیادہ کبھی کبھی دوسروں کی خاطر ظہور میں آئی ہیں۔ لکھنؤ میں شوکت کا حلقہ احباب جس قدر وسیع تھا وہ اسی قدر دوست نواز بھی تھے۔ دوسروں کے پھٹے میں پاؤں اڑانے کی انھیں جیسی چاٹ سی پڑ گئی تھی اور اسی لئے وہ ضبط و تنظیم اور نصب و احتیاط کی منزلوں سے بہت آگے تھے۔ لکھنؤ کے احباب میں ایک صاحب تھے نیلمنی بھٹاچاریہ الہ آباد کے مشہور پروفیسر بھٹاچاریہ کے صاحبزادے۔ آل انڈیا ریڈیو میں وہ موسیقی کے پروگرام کی خدمت پر مامور تھے۔ ہم لوگوں میں خوب گھل مل گئے تھے۔ راتوں کی رنگین نشستوں میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے لیکن جیب و دامن کے فاصلہ کے وہ کچھ زیادہ ہی قائل تھے۔ ان کی اس سمجھ بوجھ اعتدال پسندی کی وجہ سے اکثر ان کے خلاف سازشیں چلتی رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ شوکت نے ایسا اقدام کیا کہ ہفتوں اور مہینوں کی کسر نکل گئی اور بھٹاچاریہ سے وہ ایسی یادگار دعوت لینے میں کامیاب ہو گئے کہ آج بھی جسے یاد کر کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ ہوا یوں کہ شوکت کو جعلی دستخط بنانے میں کمال حاصل تھا۔ ایک حکمنامہ تیار کر کے پروفیسر بخاری کے جعلی دستخطوں سے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کو روانہ کر دیا گیا۔ اس میمورنڈم میں نیلمنی بھٹاچاریہ کی ترقی کے احکامات تھے۔ اب کیا تھا، مبارکبادیوں کے شور میں شام ہی کو دعوت اور دعوت خیام کے انتظامات مکمل ہو گئے۔ مرغ دماہی اور رقص و سرود کے ساتھ کیف و سرور بھی ہو تو پھر کون نہ مر جائے اے خدا۔ رات کے دو بجے یہ کافر محفل ختم ہوئی اگلے دن صبح

ہی سے سفر کی تیاریوں کی باتیں ہونے لگیں۔ دفتر کی طرف سے رخصتی پارٹی کے انتظامات کی بات نکلی تو شوکت کچھ کھوئے کھوئے سے ہال میں ہاں ملاتے کئی کہتے ہوئے نظر آئے۔ دوپہر تک بالآخر بات پھوٹ کر رہی۔ معاملہ یکایک سنگین ہو گیا۔ تاسف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ سب نیلمی کی دلجوئی میں لگ گئے اور شوکت نیلمی کے سامنے ہاتھ جوڑے معافی کے طلبگار جیسے نظر آئے۔

شوکت کے فن میں غیر متوازن اور بے ربط پھلجھڑیوں اور انار پٹاخوں کی سی کیفیت کا جو احساس ہمیں ہوتا ہے، اس کی تہہ کو ٹٹولئے تو اس کے ڈانڈے شوکت کی زندگی سے جا ملتے ہیں۔ زندگی کا ہر عمل انسانی مقاصد کے تابع ہے۔ مقصد جتنا بلند اور ارفع ہے، زندگی اسی قدر نکھری ہوئی صاف اور ستھری ہوگی اور مقاصد میں جس قدر تضاد اور گنجلک، تشکیک اور تذبیب ہے، زندگی اسی قدر بے نظم اور الجھی ہوئی ہوگی۔ قدرت کی ستم ظریفی شوکت کے ساتھ یہ تھی کہ ان کی گھریلو زندگی ان کی باہر کی تیز رو، بے ضبط و بے ربط زندگی سے میل نہ کھاتی تھی۔ ان کی اہلیہ محترمہ پرانی وضع کی سیدھی سادی مومن مسلمان تھیں، شوکت جس قدر بولنے والے، فقرہ باز، چست و چرب زبان تھے، سعیدہ بھابی اسی قدر خاموش طبع اور غم کھانے والی بی بی تھیں۔ ریڈیو کی نوکری کے زمانے میں وہ ان کو پردے سے باہر بھی کھینچ لاتے تھے۔ شوکت کے ساتھ اگر کسی نے سعیدہ بھابی کو دیکھا ہے تو صاف محسوس کیا ہے کہ دونوں اصل بے جوڑ ہیں۔ نیچی نگاہ، جھکی جھکی، شرمائی اور لجائی وہ آکر کونے میں بیٹھ جائے گی اور شوکت ہیں کہ اپنی طلاقتی کے جوہر دکھا رہے ہیں اور لفاظی کے موتی لٹا رہے ہیں۔ گھر کی زندگی اس تضاد سے وہ کچھ کبیدہ خاطر بھی تھے اور دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر وہ حسن پرستی کی طرف کچھ زیادہ ہی مائل تھے اور اکثر ان مصائب و آلام کا شکار بھی رہے ہیں جو اس منزل کے نبرد آزماؤں کا شیوہ ہے۔ عشق، محبوب اور رقیب ان کی شاعری کے محض کردار ہی نہیں تھے۔ ان کی زندگی کے وہ جیتے جاگتے عوامل بھی تھے۔ ایک مرتبہ بڑے دلاویز انداز میں کہنے لگے، بھائی! ہم تو اب ہمہ تن ہیں آل ریڈیو میں۔ کیوں خیریت، کیا ہوا آپ کی نوکری کو، میں نے ٹوٹتے ہوئے کہا، ایک رقیب جو گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا، آج صبح سے میری نوکری کے پیچھے پڑ چکا ہے۔ اتفاق سے وہ رقیب مجھ سے کچھ پردہ نہ رکھتے تھے، اور رات کی بے لطف صحبت کی روئیداد وہ مجھے شوکت سے پہلے سنا چکے تھے۔ میں نے مزا لے کر کہا تم دونوں بدھو ہو۔ یہ منزل بڑی صبر آزما ہے۔ یہاں بڑے بڑوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ چچا غالب جیسے جہاندیدہ بھی نہ سمجھ پائے تھے کہ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے۔ میں نے موقع پا کر ان کے ایک منظوم فیچر رقاصہ پر چھینٹا دیا۔ جو کچھ ہی دن پیشتر نشر ہو چکا تھا۔ طوائفوں کی زندگی پر فیچر لکھنا آسان ہے شوکت، ان کی نفسیات کو سمجھنا دشوار ہے۔ یہ کام تو صرف ان سوختہ سامانوں کو زیب دیتا ہے جو اس منزل کی گرد راہ بن چکے ہیں۔ شوکت میں تنقید کی برداشت بالکل نہیں تھی وہ رات کی بے لطف صحبت کو بھول کر رقاصہ کی نشری حیثیت پر مجھ سے الجھ پڑے۔ شوکت نے اپنے مذاق سے ہٹ کر اس فیچر کے لئے سنجیدہ اسلوب اختیار کیا تھا۔ معاشرہ میں طوائف کی زندگی اور اس کی بے بسی اور مجبوری کے حزنیہ عناصر کو اکٹھا کر کے انھوں نے ایک طرح کی روایتی کہانی تو تیار کر لی تھی لیکن منظوم فیچر میں وہ ڈرامائی عناصر کو اجاگر کرنے میں بری طرح ناکام رہے تھے۔ رقاصہ کا پورا ڈھانچہ بیانیہ تھا۔ مثنوی کی وجہ سے کہانی کے تسلسل کو تو وہ قائم رکھ سکے لیکن پلاٹ کے ضروری اجزا، شعری ضرورتوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ نظم میں مکالموں کی مشکلات سے بھی وہ نبرد آزما نہ ہو سکے۔ رقاصہ ایک ناکام فیچر ہو جانے کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ آل انڈیا ریڈیو میں منظوم ڈرامہ کی ابتدا کا سہرا شوکت ہی کے سر ہے۔ اور "رقاصہ" آل انڈیا ریڈیو کا سب سے پہلا اردو منظوم فیچر ہے۔

شاعری کے ناطے، وہ عرصہ تک سنجیدہ شعر کہتے رہے۔ غزل اچھی خاصی کہہ لیتے تھے۔ ان کی بعض غزلیں اس دور کے بہترین فنکاروں کی آوازوں میں، ریڈیو کے ذریعہ اور ریڈیو سے باہر بھی عوام تک پہونچ چکی تھیں۔ فیض آباد کی اختری بائی، الہ آباد کی منا اور مظفر پور کی پنا بائی نے ان کے کلام کو خوب خوب گایا۔ ادھر لکھنؤ ریڈیو مشاعروں کے لئے بھی اپنا ایک خاص مقام حاصل کر چکا تھا۔ ان مشاعروں کی بدولت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بڑے شعرا سے شوکت کا راست رابطہ قائم تھا لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود شاعر کی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ ان کی سعی لاحاصل ہی رہی۔ تقسیم ہند تک وہ نثر میں مزاح اور نظم میں سنجیدگی کی دوعملی میں مبتلا رہے۔ پاکستان پہونچ کر البتہ انھوں نے اپنی شعری کاوشوں کا حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لیا ہوگا اور انھیں یہ احساس ہوا ہوگا کہ ان کے لئے اپنے اسلوب خاص کی شاعری کرنا ہی زیادہ مناسب تھا۔ چنانچہ دو چار نظموں کے بعد ہی وہ اپنے ہم عصر مزاحیہ شعرا سے آگے دوڑتے نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں شوکت اگر قیام لکھنؤ میں نثر کے ساتھ نظم میں بھی

مزاح کے تجربے کرتے رہتے تو اردو ادب کو شوکت کی سنجیدہ شاعری سے کہیں افضل ترمزاحیہ شاعر نصیب ہو جاتا۔ اور میں تو اس کا امکان سمجھتا ہوں کہ وہ اس خلاء کو بھی پر کرنے میں کامیاب ہو جاتے جو اکبر الہ آبادی کے بعد سے اردو شاعری میں ابھی تک موجود ہے۔

شرنگاری میں وہ ریڈیو کی ملازمت سے پہلے مقبولیت کے بہت ابتدائی منازل میں تھے۔ "سودیشی ریل" کے مصنف پر کسی نے قرار واقعی توجہ نہیں کی تھی۔ مشکل یہ آن پڑی تھی کہ ۱۹۳۵ء کے قانون آزادی نے ہندوستان میں سماجی اور سیاسی انقلاب کو یکایک اور محسوس شکل میں سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ شوکت اب کھل کر نہ حزب مخالف میں خود کو شمار کرا سکتے تھے اور نہ ہی سودیشی ریل کے متبادل کسی نئے رجحان پر وہ توجہ کر سکتے تھے کہ وہ حکومت کے طرفداروں میں گنے جاتے۔ ۱۹۴۷ء تک وہ بڑی خوبی سے اس مجبوری دور سے گزر گئے۔ دراصل وہ کوئی سیاسی آدمی بھی نہ تھے۔ سودیشی ریل کا محرک بھی ان کا کوئی سیاسی جذبہ نہیں تھا۔ وہ طبعاً ہنسوڑ تھے۔ اور زندگی کو وہ ایک قہقہہ سے زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ریڈیو میں ان کی کامیابی بھی دراصل ان کی غیر طرفدار حیثیت تھی جو انگریز کی حکومت کے زیر سایہ انھیں حاصل ہو گئی تھی۔ اب وہ اطمینان سے اپنے اسلوب کو ترقی دینے اور اپنی ذات کے لئے مقام پیدا کرنے میں لگ گئے۔ لکھنؤ ریڈیو کے لئے شوکت نے انبار کے انبار لکھ ڈالے ہیں۔ ان میں زیادہ تر مناجاتی قسم کے ڈرامے فیچر، نظمیں، تقریریں اور مختصر ڈرامے ہیں۔ اردو ادب کے تعلق سے ان مسودات کی اب کوئی حیثیت بھی نہیں ہے اور شوکت کے اسلوب سے تو ان کا دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق زود نویس تھے۔ جو کچھ ان سے کہا گیا وہ بے تکلف گڑھ کر کاغذ پر جما دیتے تھے۔ پھر ان مسودات کے لئے ان پر کوئی نگران بھی نہیں تھا۔ انھیں کسی کی تنقید یا تنقیح کا کبھی کوئی خوف نہیں رہا۔ وہ اپنے کام میں مختار کل تھے۔ جو چاہتے لکھتے، جیسے چاہتے لکھتے اور نشر کرتے رہتے۔ اس دور کی یادگار تخلیق دو چار اچھے تمضامین کے علاوہ صرف منشی جی ہے۔ رفیق ناتھ سرشار کے میاں خوجی کی بنیاد پر ایک کردار کا تصور ریڈیو کے لئے بالکل نیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ کتابی کردار کے خدوخال کو کس طرح آوازوں میں ڈھالا جائے۔ رفیق علی مرحوم کی آواز نے اس مشکل کو آسان کر دیا۔ منشی جی کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے آج بھی یہ بات وثوق کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ منشی جی شوکت کے قلم کا شاہکار تھے یا رفیق کی آواز کا اعجاز۔ بہرحال آواز اور مواد کا ایسا حسین امتزاج ریڈیو کو اس سے پہلے کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔

شوکت، بچوں کے پروگرام کے بھی روح رواں تھے۔ ملک حبیب احمد بچوں کے ماموں جان، اور شوکت ان کے سامنے نرے بدھو بن کر آتے تھے۔ اس پروگرام میں اپنے لطیفوں اور چٹکلوں کی پھلجھڑیاں چھوڑنے کا انھیں بہترین موقع ملتا رہا۔ لکھنؤ کے بچوں کا پروگرام ان کی ایسی تجربہ گاہ تھی جس میں انھیں اپنی اور دوسروں کی آوازوں کے صوتی اثرات کا علم ہوا۔ اور مزاح کی بے پناہ گنجائشوں کا اعتماد بھی انھیں اسی تجربہ گاہ سے حاصل ہوا۔ شوکت کے مزاح میں سادگی کے ساتھ جس بے ساختگی سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں وہ اسی تجربہ گاہ کی دین ہے۔ اپنے فن میں زندگی بھر وہ بچوں کے دماغ سے سوچتے اور بدھو میاں کا کردار ادا کرتے رہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب وہ بچوں کی بجائے جوانوں کو گدگداتے اور بوڑھوں کو ہنساتے تھے۔ پاکستان میں قاضی جی کی تخلیق میرے اس مفروضہ کی کھلی دلیل ہے۔

ریڈیو کے کردار (Stock Characters) کا اطلاق ان جانی پہچانی آوازوں پر ہوتا ہے جو تسلسل کے ساتھ سنی جاتی ہیں اور اگر سننے والوں کی یہ پسندیدہ آوازیں کسی وجہ سے پروگرام میں شامل نہ رہی ہوں تو سننے والوں کو ناگوار کمی کا احساس ہوتا ہے۔ سننے اور سنانے والوں کے درمیان ریڈیو کے یہ کردار ایسا ربط قائم کر لیتے ہیں کہ کمرہ میں رکھا ہوا لکڑی کا ایک بے جان ڈبہ کچھ دیر کے لئے زندہ حقیقت کا مالک بن جاتا ہے اور اس طرح یہ کردار گھروں اور خاندانوں کی سکاہٹوں اور قہقہوں میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ شوکت کو ریڈیو کردار بننے کے جو مواقع لکھنؤ میں ملے اور ان سے جو تجربات انھوں نے حاصل کئے ان تجربات کی بنیاد پر انھوں نے پاکستان میں قاضی جی کی تخلیق کی۔ اور اس کردار کو کامیاب کر کے انھوں نے خود ریڈیو کردار کی حیثیت کو بہت بلند کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے براڈ کاسٹنگ سسٹم میں شاید ہی کسی کردار کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی ہو جو ریڈیو پاکستان لاہور کے قاضی جی کو اس ملک میں کچھ دنوں کے لئے حاصل ہو گئی تھی لیکن قاضی جی کے اجزائے ترکیبی پر غور کیجئے تو وہی منشی جی کا نقش ثانی ہے جسے لاہور میں بڑے اہتمام سے تیار کیا گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس دفعہ قلم کے ساتھ آواز بھی شوکت کی تھی اور یہ وہی آواز تھی جس کی صلاحیتوں کا بھرپور تجربہ وہ لکھنؤ میں بچوں کے پروگرام میں کر چکے تھے۔

۱۹۴۷ء میں لکھنؤ سے بدل کر میں بمبئی پہونچا۔ حبیب احمد پہلے ہی لاہور جا چکے تھے۔ انصار دہلی اور ملک صاحب پشاور سدھار گئے۔ اور اس طرح لکھنؤ کی یہ کارگزار ٹیم ٹکڑے ٹکڑے کر کے سارے ہندوستان میں بکھیر دی گئی۔ شوکت اب نئے ماحول میں کچھ بددل بھی ہو گئے تھے۔ منشی جی جیسے کسی دوسرے

کردار کی نمائش کی طرف وہ مائل ہی نہ تھے اور نہ اب اس کی گنجائش ہی باقی رہی تھی۔ پروگرام کے صاحب اختیار لوگوں میں اب کرشن چندر، شوامر عادل نہندر اور حفیظ جاوید جیسے فنی قسم کے لوگ لکھنؤ پہونچ گئے تھے۔ ان لوگوں نے شاید اس اسٹیشن کے پروگراموں کو موقر تو زیادہ بنایا لیکن اپنی بڑھتی ہوئی مقبولیت میں وہ شوکت کی ذات کو کماحقہ متعین نہیں کر سکے۔

ادھر پچھلی جنگ نے اتحادیوں کے خلاف زور پکڑا تو پبلسٹی کے ساتھ فوجی بھرتی کی ضرورت پر زور دیا جانے لگا۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے ابولاثر حفیظ جالندھری کی نگرانی میں Song Publicity کا ایک نیا محکمہ شروع کیا جس کی شاخیں پورے ہندوستان میں کھول دی گئیں۔ اس محکمہ کا مقصد فوجی بھرتی کو تیز کرنا تھا۔ لکھنؤ میں یہ جگہ شوکت کو دی گئی۔ اور وہ مقامی Song Publicity کے ناظم مقرر ہو گئے۔

شوکت کی زندگی کے اس نئے موڑ نے ترغیبات میں اضافہ کے ساتھ ان تحریصات کو بھی ابھارا جو ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں ان کے قلب میں مچل مچل کر رہ گئی تھیں۔ ابھی تک وہ چارخور محض تھے اور بن پئے بہکتے جانے کے قائل۔ ان کی تعیش پسند طبیعت چوک کے گرد چکر لگانے ہنسنے اور بولنے تک محدود تھی لیکن اب وہ گونہ بیخودی کے ساتھ نشاط کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔ بزرگوں کا قول ہے کہ دولت کی طرح وجاہت بھی ہر شخص کو راس نہیں آتی۔ یہ وہ آلِ ہوس ہے جو انسان کے ایمان تک کو متزلزل کر دیتا ہے۔ آج کے اس غیر مذہبی سماج میں اور اس سماج کے اس لامذہب ادب میں ایمان کی بات نہ بھی چھیڑیئے تو انفرادی اخلاق و عادات اور اعمال کے تعلق سے بھی اس خطرہ کا امکان قوی ہے کہ مبادا شوکت کی یہ نئی زندگی اُن کے فن پر بھی اثر انداز ہوئی ہو۔ بات وہی غم دوراں کی ہے جسے پھیلا کر کیجئے تو دبی دبی طبعی اور شکم پروری دولت کی نہ مٹنے والی بھوک اور وجاہت و غلبہ کی نہ بجھنے والی پیاس نے فنکار کے فکر و نظر کو گھیرے میں لے لیا اور پیٹ اور جیب کی ذہنیت نے اس کی دردمند مینی کو دبا لیا۔ فطرت نے جس فیاضی سے ذہانت و ذکاوت کے ساتھ اظہار کی بے پناہ قوت شوکت کو عطا کی تھی افسوس وہ اوپر نہ اٹھ سکی۔ عالم خیال میں اس خوش فکر مصنف نے چاہے کچھ بھی لکھا ہو عملی زندگی میں ان کے وہ تجربے جو ایک آرٹسٹ کے ناطے اپنے فن میں سمو کر وہ ہمیں لوٹا گئے ہیں، ادھورے ادھورے اچٹتے ہوئے نارسا اور نیم رس محسوس ہوتے ہیں۔

اتنی سی بات کہہ کر میں نے شاید شوکت کے ثنا خوانوں کو خود اس مضمون پر جھپٹ پڑنے کی دعوت دے رہی ہے۔ لیکن میں یہ بات ایک بار پھر جتا دینا چاہتا ہوں کہ شوکت کا خون پاک و صاف تھا۔ وہ ایک دیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی زندگی شرافت و ایمانداری اور مذہب و دینداری کے توارث کا نمونہ بن سکتی تھی۔ لیکن برا ہو ماحول کا ایک طرف جس نے شوکت کی ذہانت کو علم کی راہبری سے محروم رکھا اور دوسری طرف اسی نئی زندگی کی بے سمجھی بے بوجھی تحریصات میں جکڑ کر رکھ دیا۔

فنکار کو اس کے ماحول میں مطالعہ کرنے کے جس زاویہ سے میں نے شوکت کی زندگی کو دیکھا ہے اس میں زندگی کا تضاد ضرورت سے کچھ زیادہ نمایاں ہے لیکن یہی آج کی عام زندگی کا المیہ بھی ہے۔ یہ شوکت کی زندگی کے لئے کچھ مخصوص نہیں۔ وہ تو ایک مثال ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ زندگی کا عام ڈھانچہ ہی ایسا ہے۔ زندگی کی وسعتوں کے باوجود اور اس کی بے شمار رنگتوں کے باوصف، ہمارے فنکار کے خارجی تجربات کا میدان سمٹا ہوا اور تنگ ہے۔ اس کی نظر ٹھیری ہوئی اور فکر سست گام ہے۔ ایسے میں پرواز کی کوتاہی کا ذکر ہی کیوں کیجئے اور تخیل کی پستیوں کی بات ہی کیوں چھیڑیئے۔ اکبر الہ آبادی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے دو ایک فنکاروں کو چھوڑ کر طنز و مزاح میں طائر اکثر زیر دام ہی رہا۔ طائر بام ان میں سے مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ دراصل ہمارا اس صنف لطیف میں فکری گمراہی کی اپنے لئے نہ صرف چھوٹ سمجھتا ہے بلکہ ہر چراگاہ میں منھ مارنے اور ہر وادی میں بھٹکنے کا وہ خود کو مجاز بھی گردانتا ہے۔ زندگی کو کوکٹ پتلیوں کا تماشا سمجھ کر وہ اکبر کا دربار تو سجا دیتا ہے لیکن ہوا میں کچھ دیر اچھل کود کر کاٹ کی بے جان گڑیوں کا ڈھیر لگا کر وہ اس دنیا سے چل دیتا ہے۔ ہمارے نقادوں نے اس کے فضل میں اس کے قول کی صداقت کو پرکھنا کبھی روا رکھا اور نہ اس کے عمل میں نیت کی جانچ کی اس نے کبھی ضرورت محسوس کی۔ اور اسی لئے اردو ادب میں طنز و مزاح کے اس بے شمار ذخیرہ پر جو ہمیں ورثہ میں ملا عام طور پر بے مقصدی کی چھاپ سی لگی ہوئی ہے اور ہمارے اکثر فنکار اسی لئے بے مقصدی کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے نظر آتے ہیں۔

شوکت سے آخری ملاقات دہلی میں لالہ سری رام کے مشاعرہ میں ہوئی۔ وہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پاکستان سے آئے تھے۔ مشاعرہ گرم تھا اور وہ خود بھی کچھ سرور میں تھے کہ انھوں نے قاضی جی کے پروگرام کی بات چھیڑ دی اور کہنے لگے "بھائی قاضی جی کے متعلق تیری خاموشی ناقابل معافی جرم ہے۔ میں نے کہا ایک ہندوستانی کے ناطے میری وہی رائے ہے جو ہندوستان میں قاضی جی کے متعلق عام ہے۔ مشہور ہے کہ وہ ہندوستان مخالف اور دل آزار

کردار ہے۔ وہ تڑپ کر بولے۔ مجھ سے ہر ہندوستانی نے یہی کہا ہے اور ایک پاکستانی کی حیثیت سے میرے لئے اس رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن ہم اور تم دو الگ الگ ملکوں کے شہری ہوتے ہوئے بھی پیشہ کے اعتبار سے ایک ہیں۔ آخر قاضی جی کی نشری حیثیت بھی تو ہے۔ تجھ سے میں اپنے اس کردار کی داد چاہتا تھا جسے پنجاب کی سنگلاخ زمین میں جاگر خون جگر سے جس کی آبیاری کر کے میں نے پروان چڑھایا ہے۔ شوکت سرور کی اس منزل میں تھے جب بات کی تکرار میں انسان کو لطف مزید آتا ہے اور کیف کے اس عالم میں تھے جب کرم بھی مائل ستم بن جاتا ہے۔ کہنے لگے بھائی! تیری طرف سے کوئی ثانی جواب نہ ملنے کا افسوس ہے مشاعرہ گرم تھا۔ داد کا طوفان اٹھ رہا تھا اور بلند سے بلند تر ہو رہا تھا۔ لیکن شوکت اپنی ترنگ میں اصرار کئے جا رہے تھے کہ میں ان کے قاضی جی کے متعلق کوئی ان کی پسندیدہ بات کہہ دوں۔ ٹالنے کی غرض سے میں نے شوکت کی توجہ مشاعرہ کی طرف مبذول کرنی چاہی تو وہ اس کی تاب نہ لا سکے یکایک کھڑے ہو گئے اور کچھ بلند آواز میں کہنے لگے "معلوم ہو گیا تو کوئی جواب دینا ہی نہیں چاہتا لیکن فوراً ہی پھر سنبھل کر وہ اپنی جگہ بیٹھ گئے اور نرم پڑتے ہوئے دھیمی آواز میں کہنے لگے گر میری بات تو سن لے۔ قاضی جی کے کردار میں ہندوستان دشمنی سے زیادہ ہندوستان دوستی بلغوف ہے۔ شوکت کی سنجیدگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے لیکن ڈرتے ڈرتے میں نے کہا۔ اس بلغوف کا جواب نہیں شوکت" قاضی جی کا بھی کہاں جواب ہے۔ شوکت نے اب گفتگو کے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ آخر مجھے کہنے لگا کہ ستر برس کے ایک بڈھے کو سٹ کو لکھنؤ کے محلہ گولہ گنج سے کھینچتا ہوا میں لاہور لے آیا۔ اگر تم نے پروگرام سنا ہے تو یہ بھی سنا ہو گا کہ جس سماج کے نمائندے قاضی جی ہیں۔ اس کی تہذیب، زبان اور مذہب کو میں نے بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کردار میں پاکستان کو میں نے یہ بھی بتایا کہ ہندو پاکستان کی تقسیم جغرافیائی ہے اور تہذیب کے وہ عناصر جن سے پاکستان خود کو ایک قوم کہتا رہا ہے وہ صرف قاضی جی کے پاس ہیں اور کسی کے پاس ان میں سے کچھ نہیں۔ زبان نہیں، کلچر نہ مذہب نہیں... اور ایک سانس میں جانے کیا کیا کچھ کہہ گئے۔ میں صرف..... سے ان کی مسلسل اور تتر بتر گفتگو کو ختم کر رہا ہوں۔

میں حیران رہ گیا۔ جس انداز سے شوکت اپنی عظیم تخلیق پر روشنی ڈال رہے تھے وہ سو فیصدی صحیح نہ بھی ہو مگر قاضی جی کے کردار کو سمجھنے کے لئے ان کی یہ توجیہ ہند و پاکستان کے لئے یکساں قابل غور ضرور ہے

میں سوچتا ہوں کہ شوکت اگر قاضی جی کے کردار کو پاکستان کی وقتی سیاسیات میں نہ الجھاتے تو اس کردار کی افادیت خود پاکستان کے لئے زیادہ موثر ثابت ہوتی اور یہ کردار پنڈت رتن ناتھ سرشار کے خوجی سے زیادہ جاندار اردو ادب میں قائم و دائم رہتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ورسٹڈ ویونگ اور ہوزری یارن کی
ضروریات کی تکمیل کے لئے یاد رکھیئے
حرف آخر
کپور سپن
KAPUR S PUN
تیار کردہ:۔ کپور سپنگ ملز۔ ڈاک خانہ رانا، اینڈ سلک ملز۔ امرت سر

رُوح الامین ادیب

(ہم عصر حسرت موہانی)

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

اردو زبان اپنی اصل اور نسل سے کس زبان سے رشتہ رکھتی ہے؟ اس پر اب بحث کی ضرورت، نہ صراحت کی، نیز یہ کہ موجودہ ہندوستان جن بنیادوں کو اس سے رشتہ توڑنا چاہتا ہے، اس پر نہ ماتم کی ضرورت ہے، نہ آہ و فغاں کی۔ بلکہ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ اردو کی بڑھتی ہوئی اور پھیلتی ہوئی جڑوں کی دیکھ بھال کی جائے، اور اس کی نشو و نما میں جن لوگوں نے حصہ لیا ہے، ان کے کارناموں کو باقی رکھا جائے اس طرح ہم اردو کو زندہ رکھ سکیں گے اور زیادہ موثر طریقے سے خدمت کر سکیں گے۔ یہ وقت اب محض عملی کام کا ہے۔ ردّ و تدّح کا نہیں۔ اور اردو کا علمی کام کرنے والے اداروں میں جامعہ اردو علی گڈھ کا نام اس وقت سرفہرست لیا جا سکتا ہے اس ادارے کی بدولت ہند و بیرون ہند میں، اردو کا کام جس تندہی، لگن، ذوق و شوق اور خاموشی سے ہو رہا ہے، اس کی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔ تقریباً سات آٹھ ہزار طلبہ و طالبات کا کسی اردو کے امتحان میں شرکت کرنا، اور انگریزی و ہندی کے امتحانات میں پاس کرنے کے بعد، خود کفیل بننا۔ کوئی کارنامہ نہیں۔ ایسی ہی لگن اردو کے ہر دردمند دل میں پیدا ہونی چاہیئے۔

سال گذشتہ جامعہ اردو علی گڈھ کے امتحانات کے سلسلے میں مجھے یوپی کے ایک مشہور قصبہ کوڑا جہاں آباد (ضلع فتح پور) میں قیام کرنا پڑا۔ وہاں کے لوگوں سے مل کر، ان کی مہمان داری اور خوش اخلاقی دیکھ کر، بہت مسرت ہوئی، اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی ہماری قصباتی زندگی میں فیشن پرستی اور بے راہ روی کے جراثیم داخل نہیں ہوئے ہیں، جس نے مشرقی آداب لحاظ کو مجروح کر رکھا ہے۔ جا بجا بڑے بڑے قلعہ نما مکانات مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ فلک شگاف محلات اب عہد بابل کی یاد دلاتے ہیں۔ دو ایک گھر جو باقی ہیں وہ بھی آثار قدیمہ میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ کوڑا جہاں آباد کے ارد گرد کے مواضعات کا بھی یہی عالم ہے۔ میرا قیام جس مکان میں تھا، اس سے چند گز کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی تین در کی مسجد بنی ہوئی ہے، جو امتداد زمانہ اور اہل خاندان کی عنایت سے محفوظ ہے اور اچھی حالت میں ہے۔ اس پر جو کتبہ نصب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد ۹۶۸ھ میں سلطان شرقی کی امداد سے پایۂ تکمیل کو پہونچی تھی۔ اب اسے میاں والی مسجد کہتے ہیں۔ اس مسجد کی ارد گرد کی تمام عمارت ملبے کا ڈھیر بن چکی ہے۔ پورا محلہ (سادات) حنفی کا تھا، اب دو ایک گھر رہ گئے ہیں۔ اور ان ہی کے دم سے شرافت و نجابت کا نام باقی ہے۔

کوڑا جہاں آباد کے ایک سمت بارہ دری اور امام باڑہ ہے، دوسری سمت بجلی خاں کا قلعہ ہے۔ جس کی بابت مشہور ہے کہ اجمار گل کے بھائی بجمی سنگھ نے مخدوم حضرت سالار قطب الدین کے ہاتھ پر بیعت کی، اور مشرف بہ اسلام ہوا۔ جس کا نام بجمی سنگھ کے بجائے بجلی خان رکھا گیا۔ یہ خاندان گوتمانہ سے تعلق رکھتا تھا، حسرت موہانی مرحوم کی ماں، اسی نو مسلم خاندان کی تھیں۔ اگرچہ ان کے والد موہان ضلع اناؤ (کان پور اور لکھنؤ کے درمیان سادات کا مشہور قصبہ) کے سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر سماعت ہے کہ قلعہ والوں سے اور ان کے اہل خاندان کے بڑے عمدہ مراسم تھے، اسی بنا پر یہ رشتہ ہوا تھا، ویسے ممکن ہے زر کثیر بھی ہاتھ آیا ہو۔ حسرت موہانی کے ایک بھائی مبین الحسن صاحب فتح پور ضلع کے ہی ایک قصبہ بندکی میں قیام پذیر ہیں۔ جن کی عمر ۷۰ سال کے لگ بھگ ہے۔ افسوس کہ میں ان کی زیارت نہ کر سکا۔ اگرچہ حسرت موہانی مرحوم سے علی گڈھ اور دہلی میں کئی بار مل چکا ہوں۔ ان کی سادگی، وضعداری اور شرافت و نیک نفسی کے گہرے نقوش باقی ہیں۔ اسی طرح حسرت کی شاعری سے ہر اردو دوست

آگاہ ہے۔ شرافت نفس، تہذیبی اور مشرقی ادب کا جس حد تک پاس ان کی شاعری میں کیا گیا ہے، وہ حسرت کا حصہ ہے۔

حسرت ہی کے ایک دوست میاں روح الامین عرف مچھن میاں تھے۔ جن کا تخلص ادیب تھا۔ آپ کے اعزاز سے جو معلومات فراہم کر سکا ہوں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسرت جتنے دن اپنی ماں کے وطن آکر مہمان ہوتے، ان کا واسطہ اس خاندان کے افراد سے رہتا اور شب و روز کے بیشتر اوقات یہیں بسر کرتے۔ ان کی صحبت اور علمیت سے فضبہ کے اہل ذوق مستفید ہوتے، شعر و سخن کے جلسے ہوتے، معرکہ آرائیاں ہوتیں، مجادلے ہوتے، سیر و تفریح ہوتی۔ لیکن حسرت کو سب سے زیادہ شغف روح الامین صاحب سے تھا، جو ان کے ہم عصر، ہم مذاق، مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ اور اس کی روایتی زندگی کے دلدادہ تھے، نیز اپنے قصبے میں، اچھی سوجھ بوجھ اور اور بہتر صلاحیت کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے تھا، قدرت نے غزل کی مادرائی کیفیات بڑی فیاضی سے عطا کی تھیں۔

میرے پیش نظر موصوف کا جو قلمی نسخہ ہے، اس سے کلام کی خوبی، سادگی، صفائی اور ذہن کی زیرکی کا خاصہ اندازہ ہوتا ہے۔ اس پر طرفہ یہ کہ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ کم از کم ان کے کلام کے خطی نسخے (جو موصوف کے دست و قلم کا ہے) اور ان کے اہل خاندان کے بیان کے مطابق، اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ کیونکہ اکثر و بیشتر کلام پر جو حک و اصلاح ہے، وہ خود شاعر کے دست و قلم کی مرہون ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب اور جس وقت اپنے کلام کی خامی پر نظر پڑتی صحت کر لیتے تھے، ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صفائی کلام کا خاص خیال رکھتے تھے اور بے ہودہ یا لغو خیالات پر طبع آزمائی نہیں کرتے تھے۔ سوقیانہ مضامین اور پامال خیالات پر توجہ نہیں دی ہے، مگر صوفیانہ اور عشق الٰہی کے مضامین خاصی تعداد میں نظم کیے ہیں۔ ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

میں وہ لذت کش جام مئے وحدت ہوں ادیب
لاکھ ساماں ہے مجھے، بے سر و ساماں ہونا

ایک غزل کا مطلع اور مقطع پڑھیے:۔

دل بھی مثال آئینہ صورت نما ہوا
اس کو جو ربط صحبت اہل صفا ہوا
مجھ کو حیات تازہ شہادت ہوئی ادیب
مقطع:۔ اک آب زندگی، مجھے جام فنا ہوا

لیکن ان کا سارا ذہنی شعور غزل اور اس کی رمزیت میں رچا ہوا ہے۔ ایسے ایسے تیکھے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے، نازکی اور ندرت خیال بھی ہے، پاس لحاظ اور رعب حسن کا دامن بھی ہاتھوں سے نہیں چھوڑا ہے۔ لطف اور کیف غزل میں اضافہ کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا ہے مگر غزل کی جان ـــــ رمزیت کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔ اس باب میں انھوں نے حسرت کی ہمنوائی کی ہے۔ اور یہی وصف ان کے کلام کا بہترین حسن ہے۔ حسن کلام اور شوخی و دل ربائی کے اکثر جرعے ایسے دل آویز انداز میں یکجا کیے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے اور بسا اوقات داغ کی غزلیت کی لطف اور حسرت کی شاعری کی چاشنی کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

یاد گیسو میں رکھا کیا ہے پریشاں ہونا
آئے دن سر پہ بلائے شب ہجراں ہونا

اور پھر یہ بھی ـــــ

خلش پائے جنوں نے مرے توڑے بازو
لینا آغوش میں اے وادی پرخار مجھے
توبہ کی تھی نہ چھوئیں گے کبھی گیسو ان کے

بت خود گر نے کیا ہائے گنہگار مجھے

اس غزل کا مقطع ہے جو قیامت سے کم نہیں :۔

کس نشیمن پہ گری آہ یہ بجلی، کہ ادیب
سانس لینا بھی قفس میں ہوا دشوار مجھے

شوخ اور والہانہ انداز فکر کی مثال دیکھیے :۔

تمہارے رو برو ٹوٹا، تمہارے ہاتھ سے ٹوٹا
زباں کا ٹوٹ، شکایت کی، شکست شیشۂ دل کی

ایک شعر اور ہے :۔

رو پوش ہو کے رہ نہ سکے وہ حجاب میں
ڈالے نگاہ شوق نے رخنے حجاب میں
گریباں کی میرے تجھے دھجیاں
اڑانا نہ باد صبا چاہیے

مندرجہ بالا سطور میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ قصبہ کوڑا جہاں آباد کی ایک سمت بارہ دری اور امام باڑہ بھی ہے۔ یہ دونوں عمارتیں شاہان اودھ سے متعلق تھیں اور میاں الماس خواجہ سرا کے انتظام و انصرام میں تھیں۔ میاں الماس جب قصبے میں آئے تو ان کے ہمراہ بنبا طوائف بھی آئی مگر اس طوائف کا دراصل تعلق ایک کالنتھ منا لال سے تھا جو بعد میں مسلمان ہو گیا اور حیدر بخش نام پایا۔ اس کی اولاد میں فدا حسین وغیرہ ہوئے، لیکن یہ سب ابھی نابالغ ہی تھے کہ حیدر بخش کو خلل دماغ کو عارضہ ہو گیا اور اسی حالت میں اس کی وفات ہو گئی۔ اس کی موت کے بعد بھائیوں (جو اپنے مذہب پر قائم تھے) نے دولت پر قبضہ کر لیا اور کل املاک کے مالک بن گئے۔ اور اس طرح حیدر بخش کی اولاد محروم الارث ہو گئی۔ اور ساری جائداد غیر مسلموں کے قبضے میں چلی گئی۔ جس کے حالیہ وارث رائے بہادر ادھیہ سرن سنگھ ہیں۔ بارہ دری اور اس کے ملحقہ باغات، جس کی مالیت اور رقبہ عاما ہے، اب بھی ان ہی کے قبضے میں ہے۔ مگر آزادی ہند سے کچھ ہی دن قبل امام باڑہ اور امام باغ داگذار ہو چکے ہیں اور شیعہ وقف کے ماتحت ہیں۔ ہر سال محرم الحرام میں باقاعدہ مجالس ہوتی ہیں۔ قصبے کے معتمد حضرات کا کہنا ہے کہ اب سے کچھ پہلے تک امام باڑہ اگرچہ اہل ہنود کے اختیار میں تھا مگر مجالس اور احترام امام باڑہ کا یہ لوگ بے حد خیال رکھتے تھے، مجالس میں باقاعدہ پابرہنہ و سر برہنہ حاضر ہوتے۔ نذر نیاز کراتے، لنگر تقسیم ہوتا اور غربا و مساکین کو امام باغ کی آمدنی سے مالی اعانت کی جاتی، لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا، حالات بدلتے گئے اور قصبے کے لوگوں نے احترام امام باڑہ کی خاطر نئے انتظام کو ضروری سمجھا اور اس سلسلے میں سعی بلیغ و زر کثیر صرف کر کے داگذاری کے احکامات حاصل کیے اس تفصیل سے قطع نظر، یہ بات خاص اہمیت رکھتی ہے کہ قصبہ میں اہل شیعہ نفی کے برابر ہیں۔ لیکن عزاداری اور مجالس امام حسین علیہ السلام باقاعدہ برپا ہوتی ہیں۔ جس میں قرب و جوار کے لوگ شرکت کرتے ہیں۔ امام باڑہ (اس سے ملحقہ مسجد، جس کی حالت بے حد خستہ ہے اور شیعہ وقف بورڈ کی خاص توجہ کی مستحق بھی خوب ہے) کشادہ اور خوبصورت بنا ہوا ہے۔ اس کے فن تعمیر میں اودھ کے مزاج اور حسن کا خاص خیال رکھا گیا ہے، نقار خانہ اور بالائی گیلری، لمبا چوڑا صحن اور دیدہ زیب نقش و نگار اب بھی اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ سماعت ہے کہ روح الامین صاحب کی اہل خاندان کی قدر و قیمت کا یہ حال تھا کہ جب تک یہ حضرات مجلس میں شرکت نہ کر لیتے، اس وقت تک مجلس رکی رہتی اور شروع نہ کی جاتی۔ افسوس کہ حضرت ادیب کی بیاض میں سلام و مراثی وغیرہ کا کلام نہیں ملا۔ ممکن ہے کوئی اور بیاض ہو جس میں ان کا مذہبی کلام محفوظ ہو جناب صدیق[1] حسن صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ موصوف کا بیشتر

[1] جناب صدیق حسن صاحب رئیس قصبہ کوڑا جہاں آباد ضلع فتح پور

کلام ان کے دیگر اعزا کے پاس کراچی میں ہے۔

بہر حال یہاں راقم ان کی غزلیات میں سے چند غزلیں بطور نمونہ پیش کر کے رخصت چاہتا ہے:-

غزل ۔ ۱

ہیں وصل میں شوخی سے پابند حیا آنکھیں
الشدرے ظالم کی مظلوم نما آنکھیں

آفت میں پھنسائیں گی، دیوانہ بنائیں گی
وہ غالیہ سا زلفیں، وہ ہوش ربا آنکھیں

کیا جانیے، کیا کرتا، کیا دیکھتا، کیا کہتا
زاہد کو بھی میری سی دیتا جو خدا آنکھیں

رحم اس کو نہ آیا تھا، تو شرم ہی آجاتی
بیداد کے شکوے پر جھکتی تو ذرا آنکھیں

کس شوق سے آیا ہوں، میں محفل جاناں میں
اے رشک عدو، دم بھر مجھ کو نہ دکھا آنکھیں

کیوں آنکھ چراتے ہو، کیوں منہ کو چھپاتے ہو
دیکھو تو کہ ہیں کب سے مشتاق نما آنکھیں

تم جان کو کھو بیٹھو یا آنکھوں کو رو بیٹھو
مدوح امیں تم سے نہ ملائیں گے ذرا آنکھیں

(سات شعر)

غزل ۔ ۲

اپنے جلوے کو نہ اب پردے کے اندر دیکھیے
بجلیاں گرتی ہیں باہر آ کے باہر دیکھیے

آئینہ ہے دیدنی یہ بھی تماشا دیکھیے
دیکھیے حال دل بے تاب، مضطر دیکھیے

اف رے خود بینی کہ پھر اس نے نہ دیکھا آئینہ
جب کہا میں نے کہ لیجے اپنا ہم سر دیکھیے

دیکھیے الزام مجھ کو بے حجابی کا مگر
اپنی چٹک، اپنی چتون، اپنے تیور دیکھیے

رہ نہ جائے دل میں شوق خون ناحق تھم رہے
گر نہ جائے ہاتھ سے غصے میں خنجر دیکھیے

پھر دل گم گشتہ یاد آیا، مجھے، یاد ش بخیر

پھر خیال آیا کہ اس کی جستجو کر، دیکھیے
پھر دل ویراں میں اس بت کا خیال آیا ادیبؔ
پھر ہوا آباد یہ اجڑا ہوا گھر دیکھیے (سات شعر)

غزل - ۳

کیا کہوں ہمدم دل پُرآرزو کی آرزو
آرزو اور اس بت بیگانہ خو کی آرزو
رنج و تنہائی سے کچھ باقی نہیں عقل و تمیز
اپنے سائے سے ہے مجھکو گفتگو کی آرزو
۲ ایک ہو سکتی ہے دنیا میں بھلا مرگ و حیات؟
یہ ہماری آرزو ہے، وہ عدو کی آرزو
آپ کے پیماں نہیں یا میرے جگر کی حسرتیں
آپ کا خنجر ہے یا میرے گلو کی آرزو
کون سمجھے اس دل بے مدعا کا مدعا
کون پوچھے اس دل پرآرزو کی آرزو
مبتلائے عشق کا اللہ رے ذوق ابتلا
غم کا غم، حسرت کی حسرت، آرزو کی آرزو (ناتمام - ۶ شعر)

غزل - ۴

سراپا عشق ہوں، گویا نہیں ہے، گو زباں میری
مگر کچھ پاؤں پڑ کر کہہ رہی ہیں، بیڑیاں میری
۳ پریشاں بوئے گل، حیرت میں نرگس، باغباں خاموش
مگر بلبل نے شاید سیکھ لی طرز فغاں میری
۴ مرے سوز نہاں کا بعد میں تھا یہ عجب عالم
ہزاروں ہڈیاں بن کر جلی ہیں ہڈیاں میری

۲: غالبؔ کا شعر ہے: قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
کتنی عمدہ تکذیب یا تشریح ہے، اور نئے انداز میں۔

۳: غالبؔ کا شعر ہے، بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
ادیبؔ نے اس مضمون کو نئے معنی میں تلاش کیا ہے:۔

۴: بہادر شاہ ظفرؔ کا مشہور عالم شعر بھی اس مضمون کا ہے:۔
ہڈی ہڈی مری اے سوز نہاں جلتی ہے — شمع اس رنگ سے محفل میں کہاں جلتی ہے۔

مری بگڑی ہوئی صورت پہ بگڑے ہیں وہ کچھ ایسے
بیاں سے پہلے ہی سن لی ہے گویا داستاں میری
گریباں نے کیا مجبور، مجھ کو ضعف نے ایسا
الجھ کر رہ گئیں ہاتھوں میں میرے دھجیاں میری (ناتمام - ۵ شعر)

غزل - ۵

آہ کرنا دل حزیں، نہ کہیں
آگ لگ جائیگی، کہیں نہ کہیں
گو رہیں بھی ہے یہی کھٹکا
آسماں ہو، تہہ زمیں نہ کہیں
میرے دل سے نکل کے دنیا میں
چین سے حسرتیں رہیں نہ کہیں
وہ مرے اضطراب کی باتیں
نامہ بر اُلٹے سب کہیں نہ کہیں
ہم سمجھتے ہیں تم کو خوب ادیب
چوٹ کھا آئے ہو کہیں نہ کہیں (۵ شعر)

غزل - ۶

مری فریاد میں تاثیر تھی یہ جذب کامل کی
نگاہِ خیال میں کھنچ کر پھری تصویر قاتل کی
خبر ہم کو نہ دلکی ہے، نہ دل ہے ہم سے کچھ واقف
خدا جانے کہاں ہم ہیں، خدا جانے لگی، دل کی
تمہارے رد بر د ٹوٹا، تمہارے ہاتھ سے ٹوٹا
زباں کاٹو شکایت کی، شکست شیشہ دل کی
چمن میں لالہ و گل، اس لیے رنگیں کفن آئے
کہ چھپتیں تھیں گریباں گیر، خونِ دل، عنا دل کی
ہوا پر لیلیٰ ناقہ سوار آئی، نظر شاید
بلائیں اڑ کے لیتا ہے غبار قیس محمل کی
مگر راہ محبت میں ادیب ناتواں بن کر
جگر سے درد نے اٹھ کر مرے پہلو میں منزل کی

(۶ شعر)

غزل - ۷

زمیں مقتل کی دیتی تھی دہائی، اب سے کچھ پہلے
مرے نالے میں شاید تھی خدائی اب سے کچھ پہلے
مرا رنگ عدو ان کو تو شاید کھینچ لایا ہے
نہ تھی نالے میں گر میرے رسائی اب سے کچھ پہلے
نہ تھا رنگ حنا ظالم سجھے چھینٹے خون ناحق کے
پیام قتل تھا دست حنائی اب سے کچھ پہلے
ادھر گلچیں نے گل توڑا، ادھر بلبل نے دم توڑا
خزاں تیرا برا ہو کیوں نہ آئی اب سے کچھ پہلے

(ناتمام - ۴ شعر)

سودا کے کلام میں ایک قطعہ نما غزل ہے، جسے مثنوی کی قسم کہہ سکتے ہیں۔ اس قطعہ میں جو واردات قلبی اور تاثرات بیان کیے گیے ہیں، وہ خالص غزل کی ہیئت ہے۔ لطف یہ کہ مختصر بحر میں دل کی کیفیات، کس مزے سے بیان کی ہیں، دل میں گھر کرنے والی اور موثر زبان استعمال کی ہے۔

غزل - قطعہ نما

۸

ان سے بیداد کی شکایت کی
او زباں تو نے کیا قیامت کی

نہ کئی ہم نے رات فرقت کی
دیکھ لی بات تاب و طاقت کی

چارہ گر بھی ہمیں مبتلائے جنوں
واہ تاثیر میری وحشت کی

گر نہ دیکھو میری طرف لیکن
آنکھ چھپتی نہیں محبت کی

ق

کل یہ دل نے کہا کہ اس بت سے
لکھیے روداد رنج و الفت کی

کہیے شوق وصال بالتفصیل
کہیے بیداد و درد فرقت کی

کیجیے کچھ بیان جوش جنوں
کیجیے شرح روز وحشت کی

لکھیے کچھ دل کے اضطراب کا حال
کہیے کچھ شدتیں اذیت کی

غیر کی کچھ برائیاں کیجے
کچھ ثنا ان کی شکل و صورت کی

شاید ان میں سے نکلے کوئی بات
طرز بدلے ذرا طبیعت کی

دل سے جاتا رہے یہ شوق ستم
جی میں آجائے لطف و الفت کی

بس اسی وقت بزم میں جا کر
ظاہر اس بت سے سب حقیقت کی

درد فرقت بھی، اب بیان کیا
کچھ عیاں وصل کی بھی حسرت کی

کج ادائی کے بھی کیے شکوے
بے وفائی کی بھی شکایت کی

سن کے تقریر میری فرمایا ہم نے درخواست کی تھی چاہت کی
بے وفا آج ہم نئے تو نہیں تم نے ہم سے عبث محبت کی
خود بخود تم ہو، ہم اسیر بلا اب سزا بھگتو اس حماقت کی
سن کے اس بیوفا سے صاف جواب ہم نے مہر وفا پہ لعنت کی
کوئے قاتل سے آ گئے رسوا
بچ گئی جان، خود بدولت کی (۲۹ شعر)

ابیات

فصل گل آئی مبارک ہو جنوں کو وحشت
مژدہ دل والوں کو سودائے بیاباں ہونا
الٰہی یہ کس کی نظر ہو گئی
مرے دلکی ان کو خبر ہو گئی
سبھی گل زیر بکف ہیں اک ترے حسن گلستاں میں
رہے اک بس ہمیں ارماں بھرے فصل بہاراں میں
کروٹیں شوق نے لیں درد نے پہلو بدلا
واہ رے ضبط کہ تم نے ہی نہ پہلو بدلا
حشر کا دن بھی اسی میں گذرا
طول دیکھو شب تنہائی کا
کونسا جرم کیا ہے، ترے دیوانوں نے
شور زنجیر بھی ظالم ترے زنداں میں نہیں
پوچھتے کیا ہو ادیب حال چراغ تربت
بے کسی پر مرے افسردہ ہے ٹھنڈا ہو کر

نگار کے مندرجات کا اشاریہ

مرتبہ: سعدیہ حفیظ و خالدہ عباسی

۱۹۲۲ء سے اب تک جو کچھ بھی نگار میں شایع ہوا اس کا اشاریہ ایک خاص نمبر میں شایع کیا جا رہا ہے۔ ابھی سے اس شمارے کی کاپی اپنے لیے محفوظ کرا لیجیے۔

(مینیجر)

شمیم کرہانی

داستانِ بے ستون و کوہ کن

میر تقی میرؔ

باز آئیں بیانِ عشق سے کیا
میرؔ نام اک جواں سنا ہوگا

اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی
اُسی عاشق کے یار ہیں ہم بھی

جس کی باتوں میں جسکے شعروں میں
ایسا رنگیں نوا کہ جس کی غزل

ساری مستی شراب کی سی ہے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

تھا وہی آفتاب سا روشن
ہر گلستاں میں ہر بیاباں میں

بزم میں جو چراغ تھا گُل تھا
اُس کی زنجیرِ پا ہی کا غُل تھا

تھا تو شاعر وہ گوشہ گیر مگر
عشق میں کی بسر سلیقے سے

اُس نے روئے زمیں تمام لیا
اپنی ناکامیوں سے کام لیا

اس کا ہر شعر تھا کوئی نادک
سرسری تم نے دیکھا اس کا کلام

اس کا ہر لفظ کوئی نشتر تھا
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

اس کا رستہ تھا پیار کا رستہ
میرؔ شاعر بھی زور کوئی تھا

اس کی منزل تھی منزلِ محبوب
دیکھتے ہو نہ بات کا اُسلوب

غزل اک تحفۂ گراں مایہ
اکثر اہلِ کلام کی آواز

بیت اک انتخاب کی سی ہے
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

جس کے شعروں کی آب و تاب پوچھ
تشنہ لب مر گیا وہ عاشق زار

دھوم ہے جس کی خوش بیانی کی
نہ ملی ایک بوند پانی کی

روش اس کی تو خاص ہے لیکن
واسطہ جس کو راہ عام سے ہے

شعر جس کے ہیں سب "خواص پسند"
پر اُسے گفتگو عوام سے ہے

سادہ سادہ سی گفتگو کر کے
غنچے رنگین وہ کھلاتا ہے

میر صنّاع ہے ملوّس سے
دیکھو باتیں تو کیا بناتا ہے

دیکھتا ہوں تو سادہ سادہ لفظ
سوچتا ہوں تو رنگ رنگ کے جام

شعر کیوں اسکے کھینچتے ہیں دل
ان میں کچھ طرز ہے نہ کچھ ایہام

اُس کے ہر شعر میں نظر آئیں
جھلکیاں زیست کے فسانے کی

شعر دل میں اتر تو جاتا ہے
بات لگتی تو ہے ٹھکانے کی

عشق کی بات عقل سے نہ کہو
درد کو درد آشنا سمجھے

میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز
بے حقیقت ہے شیخ کیا سمجھے

آج شعر و سخن کی محفل میں
زندگی میر کے کلام سے ہے

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

اس کے اشعار ہی بتاتے ہیں
دل نے الفت میں چوٹ کھائی ہے

مر گیا فقر و فاقہ میں سرمست
کیا دِوانے نے موت پائی ہے

عمر بیتی سرور سے خالی
زیست گزری نشاط سے محروم

یہی جانا کہ کچھ نہیں جانا
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

اُس کے آنسو تھے اسکو بادۂ ناب
اُس کی قسمت میں تھی شراب کہاں

عشق کا گھر تھا میر سے آباد!
ایسے اب خانماں خراب کہاں

تھے حقائق جو عہد میر میں کل!
آج اس دور میں فسانے ہیں

کیا ہیں صحرا نورد یوں کے مزے
وہی جانیں جو خاک چھانے ہیں

زندگانی گذارتا تھا وہ
اپنے خوں گشتہ دل کے ماتم میں

بے خودی پر نہ میر کی جاؤ
تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

اس کو پروائے التفات نہیں
نہ کرے گر کوئی نگاہ تو کیا
میر کیا ہے، فقیر، مستغنی،
آ دے اُس پاس بادشاہ تو کیا

سوزِ غم سے ہوا جو دل روشن
تو وہ سمجھا کوئی چراغ جلا
اہلِ دنیا سے رہتا تھا بیزار
کس سے ملتا تھا وہ دماغ جلا

تھا تو پاسِ خودی اسے لیکن
دور تھا نشۂ غرور سے وہ
خوش ہیں دیوانگی میر سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

خاکساروں سے جھک کے ملتا تھا
سرگرانوں سے سرگرانی تھی
فقر پر بھی تھا میر کے اک رنگ
کفنی پہنی تو زعفرانی تھی

کیا قلندر تھا، کیا فقیر تھا وہ
تنگ دستی میں شاد رہتا تھا
ایسا دیکھا نہ کوئی رند فقیر
فاقہ مستی میں شاد رہتا تھا

ایسا عاشق کہ جس کا قول یہ تھا
عشق ہے گل سے تا بہ زہرہ و ماہ
عشق بنیاد بندگی کی ہے
عشق ہے، لا الٰہ الا اللہ

عیش کا گل، نشاط کا غنچہ
اس نے کب باغِ دہر سے توڑا
سوزِ غم سے مسلسل اس کا دل
جیسے پکتا ہوا کوئی پھوڑا

جو یہ اہلِ وطن سے کہتا رہا
بلبل اس گلستاں کے ہم بھی ہیں
وجہِ بے گانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

دل، سحر سے نڈھال رہتا تھا
رات کٹتی تھی کس خرابی سے

غنچۂ دل مگر کھلاتا تھا!
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

دے کے دل وہ جو ہو گیا مجبور
اس میں کیا اختیار تھا اُس کا

رو تا رہتا تھا ساری ساری رات — ہائے، کیا روزگار تھا اس کا

کر گیا اہلِ بزم کو گریاں! — حرف، جو بھی زبان سے نکلا
نامرادی کی رسم میرؔ سے ہے — طور یہ اس جوان سے نکلا

حسن ہی سے رہا سدا سروکار — عمر بھر اہلِ دل سے پیار کیا
کھینچ کے قشقہ، دیر میں بیٹھا — مذہبِ عشق اختیار کیا

شکوۂ تشنگی کیا نہ کبھی — خونِ دل ہے بھرا کیا وہ سبو
بادشاہِ سخن تھا وہ ہر چند — پیرہن میں جگہ جگہ تھا رفو

کیسی ہمت تھی کیا توانائی — غم کا سنگِ گراں، اٹھا لایا
سب پہ جس بار نے گرانی کی — اس کو یہ ناتواں، اٹھا لایا

نہیں بھولا ہے ذکرِ مظلومی — قصہ جور یاد ہے ہم کو
نامرادانہ زلیست کرتا تھا — میرؔ کا طور یاد ہے ہم کو

ہوش میں وہ نہ آسکا تا زیست — ایک عالم تھا نیم خوابی سا
خونِ دل کی گلابیاں پی کر — عمر بھر وہ رہا شرابی سا

ایسا دیکھا نہ عشق کا مجنوں! — ایسا پایا نہ عشق کا برباد
کوہکن جس کے سنگِ مدفن پر — رکھ کے تیشہ کہے ہے یا اُستاد

کب وہ پاتا نشاط کی منزل — غم جاناں نے رہنمائی کی
"بے ستوں" کوہکن سے کیا اٹھتا — عشق نے زور آزمائی کی

آہ کیسا جنوں نصیب تھا وہ — فصلِ گل صورتِ غبار آئی
رہی پیچاں سی موجِ بادِ صبا — بن کے زنجیر، ہر بہار آئی

ہو گئی انتہا محبت کی! — عشق میں جذب ہو گیا آخر
زندگی بھر اسے خوشی نہ ملی — روتے روتے جو سو گیا آخر

کو بہ کو تھا غبار سا جولاں — ہائے کیا ڈھنگ تھے دوانے کے
ایسا فن کار اور سرگرداں — انقلابات ہیں زمانے کے

مطبوعات موصولہ

میر نمبر۔ دلّی کالج میگزین

نثار احمد فاروقی کی ادارت میں دلّی کالج اپوٹنگ کلاسز کا میگزین "میر نمبر" کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ نمبر نکالنے کی عام وبا میں کسی رسالے اور پھر وہ بھی کسی کالج کے میگزین سے کوئی کارنامہ ذرا کم ہی متوقع ہوتا ہے۔ لیکن جب میگزین دلّی کالج کا ہو جس نے پہلے بھی کئی اچھے نمبر نکالے ہیں اور اس کا مرتب نثار احمد فاروقی ہو تو توقع بڑی حد تک جائز ہو جاتی ہے۔ دلی کالج نے اپنی روایت کے عین مطابق یہ نمبر ہر لحاظ سے لائق ستایش نکالا ہے کاغذ، طباعت اور ظاہری رنگ روپ تو معیاری ہیں ہی مواد بھی نثار احمد فاروقی کی ادارت میں شایع ہونے والے رسالے سے وابستہ امیدوں کو پورا کرتا ہے۔

مضمون نگاروں میں قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، آل احمد سرور، جعفر علی خاں، منوہر سہائے انور مختار الدین احمد آرزو، کلب علی خاں فائق، مبارز الدین رفعت جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ جن کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

مگر دو باتیں میں نے شدّت سے محسوس کیں۔ ان میں ایک زیادہ اہم ہے۔ نثار صاحب نے اعلان کیا تھا کہ اس نمبر میں میر سے متعلق ایک تفصیلی اشاریہ بھی شایع کیا جائے گا۔ انھوں نے یہ وعدہ پورا نہیں کیا۔ یہ کمی اس نمبر کی بہت بڑی کمی ہے۔ بار بار اس سلیقے کے ساتھ میر پہ تحریریں جمع نہ ہونگی کیا اچھا ہوتا اگر یہ نمبر اپنی تکمیل کے لیے اشاریہ میر بھی ساتھ لاتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں کئی تحریریں نظم اور نثر دونوں میں ایسی بھی ہیں جو پہلے بھی کہیں نہ کہیں شایع ہو چکی ہیں۔ عبدالحق۔ وحیدالدین سلیم۔ ڈاکٹر ابواللیث۔ آل احمد سرور کے مضامین اور مقبول حسین احمد پوری، رضا علی وحشت عزیز لکھنوی کی نظمیں اسی ذیل میں آتی ہے۔ ان میں سے کچھ غیر ضروری بھی ہیں۔ اور اگر مرتب نے ان کی شرکت کو صرف ضخامت کی خاطر نہ گوارا کیا ہے تو بھی یہ اعتراض باقی رہتا ہے کہ اصل ماخذ کا حوالہ کسی جگہ نہیں دیا گیا مرتب کے تحقیقی مزاج کے پیش نظر یہ اور بھی کھٹکتی ہے۔

جن شاعروں نے خراج عقیدت پیش کیا ہے اُن میں شمیم کرہانی سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔ ادارۂ نگار میر پہ اتنی خوب صورت اور بھرپور نظم کے لیے انھیں مبارکباد دیتا ہے۔ یہ نظم نقل کی جا رہی ہے۔

نثار احمد فاروقی کی یہ کاوش تفہیم و تعریف میر میں بے حد اہم اقدام ہے جس کے لیے ان کی حوصلہ افزائی ہونا ہی چاہیے۔ اس نمبر سے چند مضامین انتخاب کیے جائیں گے۔

تعداد صفحات ۴۶۴ ہے۔ ظاہر و باطن دونوں حیثیتوں سے خوش سلیقگی پائی جاتی ہے۔ قیمت درج نہیں۔

مادر وطن کی فلاح و بہبود کے لیے

ہمارے اقدامات

نہایت نفیس پائدار اور ہموار

اونی ویونگ یارن

اور

ہینڈ نٹنگ وول

جدید ترین طریقے سے تیار کیے جاتے ہیں

گرینڈا سے کم کوئی اون قبول نہ کیجیے

۵ دلکش رنگوں میں دستیاب: میرا۔ پارکو۔ سادھنا۔ کلاکار ——— اور ——— نوئیگ

اپنی پسند کے مطابق شیڈ طلب کیجئے

گوکل چند رتن چند وولن ملز پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی • دہلی • امرتسر